سلسلۂ ندوۃ المصنفین دہلی

(۹۹)

رموزِ عشق

از

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم اے (علیگ) پی ایچ ڈی (لندن)
بیرسٹرایٹ لا
سابق پروفیسر و صدر شعبۂ فلسفہ
جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

حقوقِ طبع محفوظ

بارِ دوم

شعبان سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق جون سنہ ۱۹۸۱ء

قیمت : مجلد ——— ۱۵/- روپے

قیمت : غیر مجلد ———

مطبوعہ : ——— نیو لیتھو آرٹ پریس دہلی

کتبہ : وجیہ اللہ رامپوری

مصنّف کی دوسری کتابیں

۱- قرآن اور تصوّف
۲- قرآن اور تعمیرِ سیرت
۳- علاجِ خوف و حزن
۴- خواجۂ بندہ نوازؒ اور اُن کا تصوف و سلوک
۵- مراقبات
۶- رموزِ اقبال
۷- فلسفہ کیا ہے ؟
۸- قنوطیت یا فلسفۂ یاس
۹- ابطالِ مادیت
۱۰- رسالۂ اخلاقیات

تراجم

۱۱- رہنمائے قرآن
۱۲- تہافتہ الفلاسفہ للغزالی
۱۳- تذکرہٗ مولانا ابوالکلام آزاد
۱۴- تاریخ مسائلِ فلسفہ
۱۵- مقدمہ فلسفۂ حاضرہ
۱۶- مقدمہ مابعد الطبیعیات
۱۷- فلسفہ کی پہلی کتاب
۱۸- تاریخ فلاسفۂ اسلام

زیرِ طبع

۱۹- بیماری اور اس کا روحانی علاج
۲۰- مکارمِ اخلاق

فہرست عنوانات

دیباچہ

پیش نظر کتاب میں آپ کو محبت اور عشق پر ایک سیر حاصل بحث ملے گی جس کو عاشقانہ انداز میں نہیں بلکہ حکیمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ہمارے علم و نظر کی حد تک اس موضوع پر اس قسم کا کوئی رسالہ یا کتاب اُردو فارسی یا انگریزی زبان میں موجود نہیں صوفیائے کرام نے جو کتابیں تحریر فرمائی ہیں وہ محض ان کے جذبات کی آئینہ دار ہیں اور ان کے الہامات اور وجدانات کی جلوہ گر ہیں کسی خاص نظم و ترتیب کی حامل نہیں۔ جذبات کو عقل کے تحت کس نے کیا ہے؟

اس کتاب میں آپ یہ معلوم کریں گے کہ محبت اور عشق کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ اگر عشق شدتِ محبت کا نام ہے تو محبت کن مراتب و مدارج کو طے کر کے عشق پر منتہی ہوتی ہے۔ اس تفصیل کو ہم عشاق ہی سے دریافت کر سکتے ہیں اور انھوں نے اس کی جذبات کی زبان میں خوب تشریح کی ہے۔ ہم نے ان کی یافت کو نہایت شرح و بسط سے پیش کیا ہے۔ ذوق و وجدان سے اس کو پاکر سادہ زبان میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اب یہ سعی کس حد تک کامیاب رہی ہے۔ وہ اس کتاب کا ہر ناظر خود تصفیہ کر سکتا ہے۔

قلب انسانی میں محبت کیسے پیدا ہوتی ہے، محبت کے اسباب و داعیات کیا ہیں وہ معلوم ہو چکے ہیں۔ حُسن و جمال، جود و احسان، ہر قسم کا کمال، باہمی روحانی مناسبت

یہ سب محبت کے محرکات ہیں اور ان ہی سے قلب انسانی میں محبت کا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ محبت فطرتِ انسانی میں داخل ہے، طبیعت اس پر مجبول ہے، یہ قسامِ ازل کا عطیہ ہے، موہبت باری ہے۔ کوئی قلب اس سے خالی و عاری نہیں، خارجی اسباب اسی نائرۂ محبت کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ اس کے بھڑک اٹھنے کے بعد انسان وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو اس کے بس میں ہوتا ہے! اس کے باطنی کمالات، یا معنوی ممکنات کار بالفعل ہو جاتے ہیں اور ظہور میں آجاتے ہیں اور اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انسان اپنے وجود کا تحقق کر لیتا ہے!

عشق و محبت کی حقیقی معنوں میں مستحق تو حق تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس میں حسن و جمال، جود و احسان، ہر قسم کا کمال بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان ہی کا وجود کامل و اکمل ہے اور ان ہی کی صفات ہر نقص و عیب سے مبرّا و منزہ ہیں۔ ان کے سوا ہر شئے مخلوق ہونے کی وجہ سے مقید و متعین ہے، اطلاق سے محروم اور مطلق و لامحدود کمال سے عاری۔ اس میں جو کچھ کمال پایا جا سکتا ہے وہ محدود ہی ہو سکتا ہے اور وہ بھی اس کا ذاتی نہیں ہوتا بلکہ محض عاریت، حق کی چند روزہ عطا و موہبت۔ سعید ہے وہ روح جس کو اس حقیقت کا حق الیقین حاصل ہو گیا ہے اور وہ حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب حقیقی قرار دے لیتا ہے اور ان ہی کے عشق و محبت میں اپنی زندگی کے چند روز بسر کر دیتا ہے۔

لیکن یہ حقیقت بھی واضح و آشکار ہے کہ مطلق کی تجلی مقید ہی میں ہو سکتی ہے، مطلق غیب الغیب ہے۔ اس کو نہ کوئی دیکھ سکتا ہے نہ پا سکتا ہے کہ اس کے عشق میں گرفتار ہو۔ جب حسن مطلق و کمال مطلق قابل ادراک نہیں اور اس کے ظہور کو صورت ہی میں دیکھا جا سکتا ہے تو چشم سر سے صورت کا دیکھنا بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ دیکھنا حقیقت مطلقہ کو اس میں پانے کے لیے ہے جو شہود اصلی ہے اور محض صورت ہی کی خاطر ہرگز ہرگز نہیں۔ اس بات کو ایک عاشق سرمدی شیخ اوحدالدین کرمانیؒ نے واضح الفاظ میں یوں

پیش کیا ہے:

زاں می نگرم بچشم سر در صورت | زیرا کہ ز معنی است اثر در صورت
ایں عالم صورت است و ما در صوریم | معنی نہ تواں دید مگر در صورت

سعید روحیں صورِ جمیلہ میں حسنِ مطلق ہی کا چشمِ باطن سے مشاہدہ کرتی ہیں اور یہ مشاہدۂ صورت ان کو حُسنِ مطلق ہی کی طرف لے جاتا ہے اور اسی کی وہ عاشق وطلبگار ہوتی ہیں۔ "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" کے یہی معنی ہیں جس کی صداقت سے انکار جہل ہے۔ اس پر سیر حاصل بحث عشق مجازی کے باب میں آپ کو ملے گی۔

عشق حقیقی کے قیام ودوام سے جو روحانی ثمرات حاصل ہوتے ہیں اس کی تفصیل اس کتاب کے آخری باب میں آپ کو ملے گی۔ آپ کو احساس ہوگا کہ انسانیت کی تکمیل اس عشق کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔ وفورِ سکر کی حالت میں جب صحو کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے کاملین کی زبان سے یہ چیخ نکل جاتی ہے:

سرّ ہمّتم جانِ جانم تن نیم | من نیم باللہ یاراں من نیم
نور یاکم آمدہ در مشت خاک | کور چشماں را دلے روشن نیم
نور نورم، نور نورم، نور نور | من چراغ پنبہ و روغن نیم

یہ بات اگر قابلِ فہم نہ سمجھی جائے تو اس کو نظر انداز کیجئے۔ شاید زندگی کے کسی مرحلہ میں آپ اس کو سمجھ سکیں، انشاء اللہ لیکن مولانا جلال الدین رومی کی اس بات پر تو آپ یقین کر سکتے ہیں کہ عشق ہی سے جسم خاکی افلاک کی پہنائیوں میں پہنچ سکتا ہے اور بلندی و عروج کی آخری منزلیں بھی اس کے زیرِ پا ہو سکتی ہیں:

جسم خاک از عشق بر افلاک شد | کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جاں طور آمد عاشقا | طور مست و خرّ موسیٰ صاعقا

عشق ہی مومن عاشق کو مقام "ولایت" پر فائز کرتا ہے اور وہاں سے

"مقام مشیخت" پر پہنچانا ہے۔ مقامِ ولایت صوفیۂ کرام کی اصطلاح میں فنا رفی اللہ بقاء باللہ وظہور باسم اللہ وصفاتہ کا نام ہے اور مقام مشیخت اللہ تعالےٰ کے اذن وحکم سے عالم ملک وملکوت میں تصرف کا نام ہے۔ اس اجمال کو آپ اس کتاب کے آخری باب سے سمجھ سکتے ہیں۔

لطیفت طبع وسبک روح افراد کے لیے پیش نظر کتاب کے مطالعہ سے حظّ وافر حاصل ہو سکتا ہے۔ لاغر صفت وزشت خو اصحاب کے لیے اس کا مطالعہ مضر ہوگا وہ اس سے پرہیز کریں۔ کسی عاشق صادق نے عشق کے متعلق یہ جو کہا ہے ہم اس سے متفق ہیں:

در مسلخ عشق جز نکو را نکشند　　لاغر صفتاں وزشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی زکشتن مگریز　　مردار بود آنکہ او را نکشند

ہم حکومت ہند کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے صمیم قلب سے شکر گزار ہیں کہ ان کی فیاضی سے ہم اس اعجالۂ نافعہ کی تحریر کے قابل ہوئے۔ اس کو اوّل انگریزی زبان میں پیش کیا گیا ہے اور بعد میں اُردو کے جامہ میں ملبوس کیا گیا۔ یہ سارا کام دو سال کی مدت میں انجام کو پہنچا۔

شکرِ شکر بشکرانہ برافشاں حافظ
کہ بکار خوش وشیریں حرکاتم دارند

میر ولی الدین
جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

اگست ۱۹۶۵ء

باب (۱)

محبت یا عشق کی حقیقت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبت یا عشق کی حقیقت

اے عشق در بیانا کہ بیان از تو محال است — خط تو ز خود باشد و خطا از تو محال است

اسم تو ز شرح است نہاد تو گناہ است — جان و دل مائے دگرے قابل بال است

عشق کا لفظ ماخوذ ہے "عشقہ" سے، اور یہ نام ہے اس بیل کا جس کو "بلاب" کہا جاتا ہے، اور ہندی میں "عشق پیچاں"۔ یہ بیل جس درخت سے لپٹ جاتی ہے اس کو بے برگ و بار کر دیتی ہے۔ پھر وہ زرد ہو جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد بالکل خشک ہو جاتا ہے، اسی طرح جب عشق قلبِ عاشق میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا درختِ وجود بھی معشوق کے جمال کی تجلّی میں محو ہو جاتا ہے، غیر محبوب اس کے قلب سے فنا ہو جاتا ہے، خود عاشق کی ذات فنا ہو جاتی ہے اور معشوق ہی معشوق[1] رہ جاتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ عشق کا لفظ غیر مشتق ہے وہ خود اپنا مادّہ ہے۔

"محبت" کا لفظ "حبہ" سے مشتق ہے اور وہ ایک بیج ہے کہ جب وہ زمین پر پڑتا ہے تو زمین کے اندر پوشیدہ ہو جاتا ہے، اس پر بارش ہوتی ہے، آفتاب چمکتا ہے، سرما اور گرما کا موسم اس پر گزر جاتا ہے لیکن وہ متغیر نہیں ہوتا، اپنے وقت پر وہ اُگتا ہے، اس میں خوشنما پھول لگتے ہیں اور ثمر آور ہوتا ہے۔ اسی طرح جب

[1] عبد الرزاق شارح ظہوری نے شرح اسباب و فتوحات الحکم سے نقل کیا ہے (مفتاح الحقائق فی کشف الدقائق از محی الدین بادشاہ قادری، مطبع سرکار عالی حیدرآباد ۱۲۹۳ھ، ص ۴۸)

محبت کا دل میں قرار ہوتا ہے، تو یہ بھی حضور و غیبت، بلا و محنت، راحت و لذت فراق و وصال سے متغیر نہیں ہوتی بلکہ اس کا نشو و نما ہوتا رہتا ہے اور شاخ و برگ و شگوفے اس میں پیدا ہوتے ہیں۔

عشق افراط و شدتِ محبت کا نام ہے جیسا کہ کہا گیا ہے :

العشق تجاوز عن الحد فی المحبۃ	عشق محبت میں حد سے تجاوز کرنا ہے
العشق عبارۃٌ عن افراط المحبۃ	عشق افراط محبت یا شدت محبت کا نام ہے
وشدّتہا، والمحبۃ اذا اشتدّت	محبت جب شدید ہو جاتی ہے اور قوی ہو جاتی
وقَوِیت سُمِّیَت عشقاً۔	ہے تو اس کا نام عشق ہو جاتا ہے۔

عشق افراطِ محبت گفتہ اند
دُر ایں معنیٰ چہ نیکو سفتہ اند

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں عشق کو فرطِ محبت سے تعبیر کیا گیا ہے (اشدّ حُبّ) جب ایسی محبت کا انسان کے قلب پر تسلط ہوتا ہے تو وہ محبوب کے سوا ہر چیز سے اندھا ہو جاتا ہے، اور یہ محبت اس کے بدن کے تمام اجزا میں جاری و ساری ہو جاتی ہے اور اس کے وجود سے متصل ہو جاتی ہے۔ ہر شے میں اس کی نظر محبوب ہی کو دیکھتی ہے اور ہر صورت میں اس کو محبوب ہی نظر آتا ہے، اس کیفیتِ قلبی کا نام "عشق" رکھا گیا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے محبت کی اس طرح تعریف کی ہے : محبت طبیعت کا میلان ہے ایسی شے کی طرف جس سے لذت حاصل ہوتی ہے، اگر یہ میلان طبیعت پختہ اور قوی ہو جاتا ہے تو اس کو عشق کہتے ہیں۔

علمائے نفسیات اس امر پر متفق ہیں کہ لغظ کے اعتبار سے محبت کسی مرغوب و موافق شے کی طرف قلب کا میلان یا انجذاب ہے اور عشق وفورِ محبت ہی کا نام ہے۔

ملا محمود قاشانی کے الفاظ میں "محبت مطالعۂ جمال کے لیے باطن کا میلان ہے" جمال کا یہاں مطلب وہی مرغوب و موافق شے ہے۔ اور عشق اسی میلان کی شدت کا نام ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اہل معرفت کے ہاں محبت ان معلومات میں سے ہے جس کی تعریف و تحدید نہیں کی جاسکتی، اس کی یافت محض وجدان ہی سے ہو سکتی ہے، اس کی تعبیر ممکن نہیں، تعریف و تحدید اس کے خفا میں اضافہ کرتی ہے، دور نہیں کرتی، لہذا محبت کی تعریف خود اس کا وجود ہے۔ اس خیال میں صداقت اس جہت سے پائی جاتی ہے کہ محبت ایک جذبۂ عالیہ ہے، اور جذبہ کا ادراک ذوق و وجدان ہی سے ہو سکتا ہے۔ نہ کہ تعقل سے۔ اسی لیے خواجہ یحییٰ معاذ نے کہا تھا: المحبۃ حالۃ لا یعبر عنھا بمقالۃ، یعنے محبت ایک حال ہے اس کی تعبیر قول یا الفاظ سے نہیں ہو سکتی۔ یا یوں کہو "محبت حالیست و حالت ہرگز قالت نباشد" ع

اے عشق دریغا کہ بیان از تو محال است

اگر عشق نہایت محبت کا نام ہے تو پھر محبت کن مدارج کو طے کر کے عشق پر منتہی ہوتی ہے؟ راہ محبت کے سالکین نے اپنے ذوق و وجدان سے ان مراتب کی خوب نشان دہی کی ہے۔ ان کی اس نفسیاتی تحلیل کی رو سے بدایت محبت "موافقت" کہلاتی ہے، اس کے بعد "میل" ہے، پھر "موانست" پھر "ہویٰ" "مودّت" پھر "خلت" پھر "شغف" پھر "تیم" پھر "ولہ" اور اس کے بعد "عشق"۔

اب ان اصطلاحات کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے: "موافقت" یہ ہے کہ محبوب (اور محبوب حقیقی تو حق تعالیٰ ہی ہیں) کے دشمنوں کو یعنی نفس و شیطان و دنیا کو دشمن اور اس کے دوستوں کو دوست سمجھیں۔ اسی کو زبان شرع میں حب للہ و بغض للہ سے تعبیر کیا گیا، کما قال علیہ الصلاۃ والسلام:

تعادی بعد او تک من خالفک　　تیری عداوت کی بنا پر ہم خلق ہیں۔ سے ان سے عداوت

من خلقك . — رکھتے ہیں جو تیرے مخالف یا عدو ہیں"

کسی محب نے اسی جذبہ کے تحت کہا تھا:

من دشمنت را دشمن — چوں دشمنت باشد کسے
جز آنکہ با دیوے بود — یا غول یا دیوانۂ

میل و موانست یہ ہے کہ ہر ایک سے بھاگے اور محبوب (حق تعالیٰ) ہی کا ہر وقت جو یا رہے، چنانچہ صدیق اکبر کا قول ہے:

من آنس باللہ استوحش عن غیر اللہ . — جو حق تعالےٰ سے اُنس کرتا ہے غیر اللہ سے وحشت کرتا ہے.

حق تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام سے فرمایا تھا:

کن لی مشتاقا وبی مستانسا ومن سوای مستوحشا" — یعنی تو میرا مشتاق اور مجھ سے مانوس ہو جا اور میرے غیر سے وحشت کر.

مودّت یہ ہے کہ محب خلوت دل میں عجز و زاری اور اشتیاق و بے قراری کے ساتھ مشغول رہے.

ہَوٰی ہے کہ دل مجاہدہ میں مصروف رہے، اور خلّت یہ ہے کہ جملہ اعضا میں دوست سرایت کر جائے اور وہ غیر دوست سے بالکل خالی ہو جائیں.

محبّت یہ ہے کہ اوصافِ ذمیمہ سے پاک اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہو جائے،

شغف یہ ہے کہ حرارتِ شوق کی شدّت کی وجہ سے حجاب دل پارہ پارہ ہو جائے لیکن آنسو نہ نکلیں تاکہ محبت کا حال کسی کو نہ معلوم ہو. محبت ربوبیت کا ایک راز ہے اور اس "سرّ ربوبیت" کا افشا کفر ہے، یہ اور بات ہے کہ غلبۂ حال کی وجہ سے طاقت یا اختیار ہی باقی نہ رہے.

تیم یہ ہے کہ بندہ محبت میں بن جائے اور اس کا اسیر ہو جائے اور تجرید ظاہری اور

تفرید باطنی سے موصوف ہو جائے، (تجرید صوفیہ کی اصطلاح میں اپنی خودی سے فنا ہونے کا نام ہے۔ یعنی اپنی خودی کو حق تعالیٰ کی خودی میں فنا کر دینا ہے، اور تفرید کے معنی غیر حق کو نظر سے دور کرنا اور حق کا حق ہی سے مشاہدہ کرنا، اور اپنی خودی کو اپنی نظر سے دور کرنا ہے)

بے فنائے خود میسر نیست دیدار شما　　می فروشد خویش را ادل خریدار شما!

ولہ یہ ہے کہ دل کے آئینہ کو جمال دوست کے روبرو کر دینا اور شراب جمال سے مست و بیخود ہو جانا اور بیماروں کی طرح رہنا۔

اور عشق خود کو گم کر دینا اور بے قرار ہو جانا ہے[1]

رسالۂ مختصر احیاء العلوم میں انسان کی باہمی محبت کے سات درجوں میں امتیاز کیا گیا ہے:

درجۂ اوّل میں موافقت طبیعت کو رکھا گیا ہے، اس کے بعد میل کا درجہ آتا ہے، غیر کی طرف میل نہیں ہوتا، اس کے بعد مودّت ہے اس کا ذکر قرآن حکیم میں بھی ہوا ہے:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ　　اللہ سے امید ہے کہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے

بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً (پ ۲۸ ع ۸)　　تمہاری عداوت ہے مودّت (دوستی) کر دے۔

مودّت کے بعد محبت کا درجہ ہے، اس کے بعد اشتیاق ہے جس میں محبوب کے افعال و حرکات کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے اور شوق کا ظہور ہوتا ہے، محبوب کو جتنا دیکھتا ہے، شوقِ دیدار اور زیادہ ہو جاتا ہے، اس کے بعد ولہ اور حیرت ہیں اور آخر میں عشق۔

اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محبت جب اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو عشق پیدا

---

[1] مجمع السلوک شرح رسالہ مکیہ مصنفہ قطب الدین دمشقی از حضرت مخدوم شیخ سعد خیرآبادی۔

ہوتا ہے بالفاظ دیگر اگر محبت میلِ باطن کا نام ہے تو عشق افراطِ میل بغیر شرکت کا۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے محبت کے گیارہ درجے قرار دیئے ہیں، ان میں سے دو کا تعلق حق تعالےٰ سے ہے اور باقی کا تعلق خلق سے ہے۔ پہلے ہم ان مراتب کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق خلق سے ہے:

(۱) محبت یا حب کا پہلا مرتبہ یا درجہ میل ہے اور وہ مطلوب کی طرف قلب کا انجذاب ہے۔ جب یہ زیادہ ہو جاتا ہے تو (۲) اس کو رغبت کہتے ہیں اور جب رغبت زیادہ ہو جاتی ہے تو (۳) اس کو طلب کہتے ہیں اور جب طلب میں زیادتی ہوتی ہے تو (۴) اس کو ولع[1] کہتے ہیں اور جب ولع سخت ہو جاتی ہے اور دائمی ہو جاتی ہے۔ تو (۵) اس کو صبابہ[2] کہتے ہیں اور جب یہ قوی ہو جاتی ہے تو (۶) اس کو ہویٰ کہا جاتا ہے، اور جب ہویٰ دل پر چھا جاتی ہے تو (۷) اس کو شغف کہتے ہیں، اب محب اپنے نفس سے فانی ہو جاتا ہے۔ جب شغف میں اور ترقی ہوتی ہے اور محب اپنے نفس سے اور خود فنا سے بھی فانی ہو جاتا ہے تو (۸) اس کو غرام[3] کہتے ہیں، اور جب (۹) یہ مستحکم ہو جائے اور پر ہو جائے اور متمکن ہو جائے، اور محب اپنے نفس اور اپنے محبوب سے بھی فانی ہو جائے تو یہ حبِ مطلق ہے اور اسی کو عشق کہا جاتا ہے اور محبت خلق کا یہ آخری مقام ہے، اس مقام میں محب حبیب ہو جاتا ہے اور حبیب محب اور ہر ایک دوسرے کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ہر ایک دوسرے کی صورت، کیونکہ روحِ عاشق صورتِ معشوق سے متمکن ہو جاتی ہے اور یہ صورتِ روحانیہ اس کے دل سے متعلق ہو جاتی ہے، اور ان میں جدائی و مفارقت و انفصال

---

[1] ولع کے لغوی معنی ہلکا ہونا، حق اڑا لینا، روکنا ہیں۔

[2] صبابہ کے لغوی معنی عشق و شوق، نرم دلی، رقتِ قلب، عشق کی گرمی اور سوزش، عشق کی تنگدلی اور الجھن کے ہیں۔

[3] لغوی معنی ہیں شیفتگی، اشتیاق، آرزو۔

محال ہو جاتا ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے:

رقّ الزجاج ورقّت الخمر فتشابہا وتشاکل الامرُ

فکانما خمرٌ ولا قدحٌ وکانما قدحٌ ولا خمرٌ[1]

یہ دو مرتبے خلق کے لیے حقیقی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے لیے بھی ہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلق کا سارا وجود حق ہی کے لیے ہے۔ لیکن حبّ اور ارادت حقیقۃً صرف خدا ہی کے لیے ہے۔ حُب کا ایک اور مرتبہ ہے جو خلق و حق دونوں میں ظاہر ہوتا ہے، اس کو وُدّ کہتے ہیں اور ودود اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں دوست رکھتے ہیں، اور بندے اس کو دوست رکھتے ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے:

فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّہُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ۔ (پ ۶ ع ۱۲) — اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو پیدا کرے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی، اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی۔

پس دو مرتبے مشترک ہیں اور یہ نہایت مراتب عشق ہیں اور ان کا وقوع جانبین میں ہوتا ہے۔ خلق میں کوئی مرتبہ عشق سے اعلیٰ نہیں۔ کیونکہ وہ،

نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ۔ (پ ۳۰ ع ۲۹) — وہ اللہ کی آگ ہے جو سلگائی گئی ہے جو دلوں تک جا پہنچتی ہے۔[2]

"فافہم"

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب ہمعات میں عشق کی حقیقت اس طرح واضح کی ہے:۔

---

[1] شیشہ اور شراب غایت صفائی و لطافت کی وجہ سے ایک دوسرے کے رنگ میں ہو گئے (اور ان میں تمیز باقی نہیں رہی)، گویا کہ شراب ہی شراب ہے جام نہیں یا جام ہی جام ہے اور شراب نہیں۔

[2] منقول از کتاب روض الازہر فی مآثر القلندر وحوض الکوثر تکملۂ روض الازہر مطبوعہ مطبع سرکاری ریاست رامپور ۱۳۲۵ھ ص ۲۹۱

"بندۂ مومن جس کا اعتقاد ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ تمام صفات کمالیہ سے موصوف ہیں اپنے کمال کو ان ہی کی یاد یا ذکر پر موقوف سمجھتا ہے اور وہ ہمیشہ حق تعالیٰ کے نام کو یاد کرتا رہتا ہے اور ان کی نعمتوں اور عنایتوں کو ملاحظہ کرتا رہتا ہے، اور اس حالت پر مداومت کی وجہ سے اس کے دل میں بیقراری، اضطراب اور قلق و جوش کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ حق تعالیٰ کا نام مبارک زبان پر لا نہیں سکتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح جسم سے پرواز کر جائے گی دیکھیا کہ کسی شاعر واقف حال نے اس جذبہ کو ادا کیا ہے:

وَيُدْرِكُنِي فِي ذِكْرِهَا قُشَعْرِيْرَةٌ
لَهَا بَيْنَ جِلْدِي وَالْعِظَامِ دَبِيْبٌ

یعنی مجھے محبوب کے ذکر کے وقت کپکپی سی ہوتی ہے میری جلد اور ہڈیوں میں اس کی باریک سی حرکت محسوس ہوتی ہے۔

غرض جب نفس میں یہ کیفیت متمکن ہو جاتی ہے اور جوہر قلب میں اتر جاتی ہے اور نفسِ ناطقہ پر اس کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو اس کو نسبتِ عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ کاملینِ اہل فنا و بقا کے نزدیک اس نسبت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ اس کا ظاہر تو روح میں ایک کیفیتِ مستقرہ ہے دوسری کیفیاتِ نفسانیہ کی طرح، اور اس کا باطن محبتِ ذاتیہ ہے جس کا حامل نفسِ مجردہ ہوتا ہے، بلکہ یہ روح کے موجود ہونے سے بیشتر پیدا ہو چکی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ مٹی اور پانی کو جانبِ اسفل میلان ہوتا ہے، اور ہوا اور آگ کو فوق کی طرف طیران ہوتا ہے، اسی طرح ہر چیز کے واسطے خواہ وہ محسوس ہو یا معقول ایک اصل اور کمال ہوتا ہے جس کی یہ مشتاق ہوتی ہے، اور جب تک اس کو پا نہیں لیتی بے تاب و بے قرار رہتی ہے۔ اور جب پا لیتی ہے تو الفت و انس محسوس کرتی ہے۔ اسی طرح کثرت کو بھی اپنی اصل وحدت کی طرف میلان و طیران ہے اور مظہر کو

اپنے ظاہر کے ساتھ ایک خاص ارتباط ہے جو اس کی اصل جبلت میں مرکوز ہے، یہاں نہ کسی خاص حالت یا نعمت کا حصول مقصود ہے اور نہ یہ امر عنایتوں و نعمتوں کی یاد پر موقوف ہے اس کو محبت ذاتیہ کہتے ہیں۔ جب روح کی کیفیتِ مستقرہ کا (جس کا اوپر ذکر ہوا) محبتِ ذاتیہ کے ساتھ اتصال ہوتا ہے تو وہ ایک ایسی مرکب حقیقت بن جاتی ہے کہ اس کا جسم تو کیفیتِ روحانی ہوتی ہے اور اس کی روح محبتِ ذاتیہ اور جس شخص میں یہ پائی جاتی ہے وہ ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتا۔

ہماری اس تحقیق سے صوفیاء کے دو مختلف اقوال میں تطبیق ہو سکتی ہے: بعض صوفیا کہتے ہیں کہ قلق و اضطراب تو ایک قسم کا عذاب ہے، اور جس کو محبوب کا وصال حاصل ہو وہ اس عذاب میں کیسے مبتلا ہو سکتا ہے؟ اور بعض کا قول ہے کہ عشق و قلق کسی وقت بھی سالک سے مرتفع نہیں ہوتا، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ ظاہر ہے کہ گروہِ اول کی مراد قلق و اضطرابِ روحانی ہے یعنی وہ کیفیت جو روح میں مستقر ہے اور گروہِ ثانی کی مراد محبتِ ذاتیہ ہے، لیکن چونکہ اکثر عارفین میں یہ دونوں کیفیتیں باہم رلی ملی ہوتی ہیں اس لیے تعبیر و تعیین میں مراد ظاہر و متحقق نہیں ہو سکتی۔

یہاں دو نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں: ایک تو یہ کہ اگر کسی عارف میں محبتِ ذاتیہ کمزور ہو جائے تو یہ اس کے حق میں موجبِ نقصان ہے گو اس کو تمام اشیاء میں سریانِ محبوب کا مشاہدہ حاصل کیوں نہ ہو،

دوسرا یہ کہ دنیا و آخرت سے تجرید اور اہل و عیال سے بے فکر ہو جانا باوجود استقامتِ مزاج اور وفورِ عقل کے بغیر اس کیفیتِ روحانی کے ممکن نہیں اور اس نسبت کے حامل کو ماسوی پر تسلط حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اس سے اعراض کرتا ہے۔ اس لیے جو شخص بھی اس کو دیکھتا ہے اس کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتا ہے۔[۱]"

[۱] قطرات ترجمۂ ہمعات، مترجمہ عبداللہ شاہ صاحب، مطبوعہ ہلال اسٹیم پریس ساڈھورہ (انبالہ) ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۹ – ۵۸ ترجمے میں اصل کو پیش نظر رکھ کر تھوڑا سا تغیر کیا گیا۔

مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ سے کسی نے پوچھا کہ عشق کیا ہے؟ فرمایا: عشق فرطِ محبت کو کہتے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا کہ عشق کا کیا لون ہوتا ہے؟ فرمایا "تمام عالم لون[رنگ ۱۲] از عشق گیرند، لونِ عشق پیدا نئے" پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے:

عشقم کہ در دو کون و مکانم پدید نیست — عنقائے مغربم کہ نشانم پدید نیست
ز ابرو و غمزہ ہر دو جہاں صید کردہ ام — منگر بداں کہ تیر و کمانم پدید نیست
چوں آفتاب در رخ ہر ذرہ ظاہرم — از غایت ظہور عیانم پدید نیست
گویم بہر زباں و بہر گوش بشنوم — ویں طرفہ ترکہ گوش و زبانم پدید نیست
چوں ہر چہ ہست در ہمہ عالم ہمہ منم — مانند در دو عالم از انم پدید نیست

پھر آپ نے فرمایا: "بعض کہتے ہیں کہ عشق آگ ہے، اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ اگر عشق آگ ہوتا تو عاشق کا منہ آنسوؤں میں غرق کیسے ہوتا؟ بعض کا قول ہے کہ عشق پانی ہے، ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ اگر عشق پانی ہوتا تو ہزاروں دل اس سے سوختہ کیوں ہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ عشق زہر ہے، تو پوچھا جائے گا کہ پھر مشتاقوں کی طبیعت میں، یہ جوش و نوش کیسے؟ اور اگر کہا جائے کہ عشق نواخت و عطا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر عشاق میں یہ شور و شغب کیوں ہوتا ہے؟ اور اگر کہیں عشق محنت ہے تو ہم کہیں گے کہ اس کو جان کے بدلے جو خریدا جاتا ہے اس پر حیرت ہے، اور اگر تم کہو کہ عشق راحت ہے، تو پھر یہ شورش کیوں ہے؟ بہر حال ہر ایک نے اس کی تعبیر کسی عبارت سے کی ہے اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے: "نہ بیانِ عبارت تمام شد نہ نشانِ اشارت درست گشت" یعنی نہ عبارت ہی سے یہ ادا ہوا اور نہ کوئی اشارہ ہی صحیح ثابت ہوا، لیکن مشائخِ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ عشق نے دل کو حضرت دوست کا یہ پیغام پہنچایا ہے کہ قرار نہ پکڑ، اور جان کو یہ پیغام کہ نشاط سے قطع تعلق کر، اور سر سے کہا کہ راحت سے دور دور رہ، منہ سے کہا کہ اپنا رنگ دور کر دے اور تن سے کہا کہ قوت کو رخصت کر اور آنکھوں سے کہا کہ

موتی بہا اور حال کو حکم دیا کہ تیرہ و تار ہو جا، زبان کو فنا کر، دوستوں سے مفارقت اختیار کر، کونین کو طلاق دے اور دونوں عالم سے جدا ہو جا......"

مولانا مسعود بک چشتی نظامی قدس سرہٗ نے عشق کے کمالات کا دلچسپ طریقہ سے اس طرح اظہار فرمایا ہے:

"اے عزیز، عشق چوں بدل رود خون کند، و چوں بدیدہ رسد جیحوں کند، و چوں بجامہ رسد چاک کند، و چوں بجاں رسد خاک کند، و چوں بمال رسد تفرقہ کند،...... العشق جنون الٰہی

کشتۂ تیغِ عشق را غسل و کفن چہ حاجت است　　زانکہ شہیدِ شوق تو بار کفن نمی کشد

اپنے کسی دوسرے مکتوب میں منیریؒ تحریر فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے صفتِ عشق و محبت انسان کے سوا کسی دوسری مخلوق میں پیدا نہیں کی؛

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

فرشتوں کے کام جو سب درست نظر آتے ہیں اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے حدیثِ محبت سنی نہیں، اور یہ اونچ نیچ جو انسان کی راہ میں نظر آتا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے حدیثِ محبت سنی ہے کہ،

یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ (پ ۶ ع ۱۲) ان سے اللہ محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

جس کسی کو محبت کا ایک شمّہ بھی ملا ہے اس سے کہہ دو کہ سلامتی کا خیال دل سے دور کر دے اور راہِ ملامت اختیار کرے اور اپنی ذات کو وداع کر دے کہ،

اَلْمَحَبَّةُ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ: محبت نہ کوئی چیز باقی رہنے دیتی ہے اور نہ کوئی چیز چھوڑتی ہے۔

جو شخص اپنے ہاتھ سے اپنا سر نہیں کاٹ سکتا وہ اس کوچہ میں قدم نہیں رکھ سکتا کہ عشق بازی جاں بازی ہے۔ مرد تو وہ ہے کہ جب وہ حدیثِ محبت

سنتا ہے اور عالمِ غیب سے تیغ نمودار ہوتی ہے تو جان و دل کو اس کے استقبال کے لیے بھیجتا ہے۔ امام احمد غزالی کا قول ہے: "مرد کو چاہیے کہ دریائے عشق میں غواصی کرے اگر اس کی موجِ مہر اس کو ساحلِ لطف تک پہنچا دے تو:

فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا۔ (پ۲۲ ع ۶) وہ بڑی کامیابی کو پہنچ گیا۔

اور اگر نہنگِ قہر اس کو نگل جائے تو:

فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (پ۵ ع ۱۱) اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ثابت ہو گیا۔

ع کس بر تو زیاں نہ کرد من ہم نکنم

المعرفةُ نارٌ والمحبةُ نارٌ فی النارِ معرفت گویا آگ ہے اور محبت آگ کی آگ"[1]

مشہور عالم فلسفی حکیم بوعلی سینا کا ایک رسالہ خاص عشق کے بیان میں ہے۔ اس میں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ عشق مجرّدات، فلکیات، عنصریات، معدنیات، نباتات وحیوانات سب میں پھیلا ہوا ہے، یہاں تک کہ علمائے ریاضی نے کہا ہے کہ اعداد متحابہ بھی ہوتے ہیں یعنی اعداد میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں اور یہ مسئلہ اقلیدس نے قلمبند نہیں کیا ہے، ابن سینا نے زیادہ کیا ہے۔ اصحاب عدد یعنی فیثاغورث اور اس کے اتباع کہتے ہیں کہ اس خاصیت کی عجیب تاثیرات ہوتی ہیں جن کا بارہا تجربہ کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ ابوالقاسم جنید بغدادی، شیخ الطائفہؒ کا عشق کی حقیقت کے متعلق ایک قول نقل کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

"العشق الفة رحمانية والهام شوقي اوجبها الله علیٰ کل ذی روح لیحصّل "عشق ایک الفت رحمانی و الہام شوقی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ہر ذی روح پر واجب

[1] معدن المعانی یعنی مکتوباتِ شرف الحق والحقیقت والہدیٰ والدین احمد یحییٰ منیری (مخطوطہ) باب ۲۳: در عشق و غیرت ص ۲۰۳ تا ص ۲۰۹۔

به اللذة العظمى التي لا يقدر على
منالها الا بتلك الالفة وهي
موجودة في النفس ومراتبها
مقررة عند اربابها فما احد
الا عاشق يستدل به على
قدر طبقة من الخلق ولذالك
كان اشرف المذاهب في الدنيا
مراتب الذين زهدوا فيها
مع كونها معاينة ومالوا الى الآخرة
مع كونها مخبرا بهم عنها بصورة
لفظ. انتهى[1]

کیا ہے، کہ عشق ہی کی وجہ سے انہیں بڑی
لذت حاصل ہو جس کو وہ بجز اس الفت
کے اور کسی طرح حاصل نہیں کر سکتے تھے۔
اور یہ الفت نفس میں موجود ہے اور اس
کے مراتب ارباب الفت کے نزدیک مقرر
ہیں، پس کوئی شخص نہیں مگر کسی ایسی چیز
پر عاشق ہے جس سے وہ اپنے طبقے کے
لوگوں کی راہ پاتا ہے اور اپنا مشرب حاصل
کرتا ہے۔ اسی لیے ان لوگوں کا مرتبہ دنیا میں
اشرف ہے جنھوں نے دنیا کو جو سامنے موجود ہے
چھوڑ دیا ہے اور آخرت کی طرف مائل ہو گئے
ہیں جس کا انھوں نے صرف ذکر ہی سنا ہو۔"

عشق و محبت کے مفہوم کی مزید تفصیل و توضیح کے لیے ہم شیخ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی بے بہا تصنیف رسالۂ عشقیہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ایک محقق نے محبت کے دس مراتب اور پچاس درجات کا نہایت تعمقِ نظر سے ذکر کیا ہے اور ہم نے ان سب کو اختیار کر دیا ہے۔ نفسِ انسانی کی ساری گہرائیاں اس بیان سے پیش نظر ہو جاتی ہیں اور محقق کے حدید البصر ہونے کا کامل ثبوت مل جاتا ہے۔ قادر الکلام شعراء کے اشعار سے وہ ان نازک جذبات کے اظہار میں بڑی مدد لیتے ہیں۔ ہم نے یہاں مفید اضافوں کے ساتھ اس تفصیل کو

[1] منقول از تذکرۃ السلوک مصنفہ حکیم نجم الغنی خاں صاحب، ص ۲۸۳ و ۲۸۴، ۱۳۱۵ھ۔

پیش کیا ہے[1]

I محبت کا پہلا مرتبہ "الفت" کے لفظ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے اور وہ مالوف کی طرف میلانِ قلب کا نام ہے۔ الفت کے پانچ درجے متمیز ہوتے ہیں:

(۱) کوئی شخص کسی سے کسی صاحبِ جمال کا ذکر سنتا ہے، اس کے دل میں اس صاحبِ جمال کی دوستی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی طلب کا داعیہ زور پکڑتا ہے، اس نفسیاتی حادثہ کو شاعر نے یوں ادا کیا تھا:

حدیثِ حسنِ او ناگہ فرو خواند در گوشم
درآمد عشق و یکبارہ ببرد از عقل و از ہوشم

یہ "الفت" ہے اور محبت کا پہلا درجہ۔

(۲) الفت کا دوسرا درجہ "کتمانِ میلان" ہے یعنی اس میلانِ قلبی کا پوشیدہ رکھنا اور اس سلسلہ میں تمام مشقتوں کا تحمل یا برداشت:

من از طبیب و پرستار ہر دو آزادم
دوائے دردِ من ایں دردِ بے دوائے من ست!

(۳) تیسرے درجہ میں تمنا کا پیدا ہوتا ہے، یہ مقام ہوس ہے، تمنائے قربتِ محبوب و آرزوئے دیدار مشتعل ہوتی ہیں، نہ جان کی پروا رہتی ہے نہ ہلاکت ہی کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے، اگر وصولِ یار دشوار یا محال ہو تو اس کی آرزو میں مرجانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرہاد نے شیریں کی تمنا میں اپنی جان ہی دے دی:

اگر فرہاد را حاصل نشد پیوند با شیریں   ہم آخر جانِ شیریں شد برآمد در تمنایش

---

[1] رسالہ عشقیہ کا یہ سارا اقتباس "صحائف السلوک" منسوب بکلام پاک حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی میں نقل کیا گیا ہے ہم نے اسی کتاب سے بحذف و اضافہ یہاں نقل کیا ہے۔ صحائف السلوک مسلم پریس قصبہ جھجر ضلع رہتک میں چھپی ہے سنہ طباعت ندارد ص ۴۳ تا ص ۶۶۔

(۴) چوتھے درجہ کو "اخبار و استخبار" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمنائے قرب و آرزوئے دیدارِ محبوب میں محب اپنے محبوب سے پوری طرح باخبر رہنا چاہتا ہے اسی لیے دریافتِ حال کیا جاتا ہے:

ہرچند دورم از تو، کہ دور از تو کس مباد
لیکن امیدِ وصلِ توام عنقریب ہست (حافظ)

(۵) پانچواں درجہ تضرع یا آہ و زاری کا ہے، تملق یا خوشامد کا ہے، عاشق روتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے:

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد؟

(امیر خسروؒ)

اے بادشہِ خوباں داد از غمِ تنہائی
دل بے تو بجان آمد وقتست کہ باز آئی

(خواجہ حافظ)

۲ محبت کا دوسرا درجہ صداقت ہے اور وہ قلب کا وفا و خطا، جفا و منع و عطا میں برابر رہنا ہے۔ اس کے بھی پانچ درجے ہیں:

(۱) پہلا درجہ "صفا" کہلاتا ہے۔ اس کے پائے جانے کی علامتیں یہ ہیں: نفس و خواہشِ نفس کا دشمن رکھنا، آرزو و مراد کی مخالفت، ترکِ شہوات یا خواہشاتِ شہوانیہ اور دنیا کی محبت کا خالی ہونا۔ اس حالت میں دوست کی نقمت (سزا، بدلہ) نعمت سمجھی جاتی ہے، اس کی بلا کو عطا!

ع زہر از کفِ دست دوست چوں شہد
باشوق خورد و برم دگر ہم

۵ هر درد و رنج کز تو رسد بر دلِ حزیں

آں محض راحت است مرا عینِ عافیت

(۲) دوسرا درجہ "غیرت" ہے۔ اس مقام میں محب غیور ہو جاتا ہے، اور غیرت کے مارے نہیں چاہتا کہ کوئی اس کے محبوب کا نام بھی لے یا اس کو ایک نظر دیکھے:

بہ گلشن میروز آں شاخِ گُل، می میرم از غیرت

کف خاکے بدست آر اے صبا، در چشمِ من گُل کن!

(نادم لاہیجانی)

حدیثِ عشق تو باکس نمی توانم گفت

کہ غیرتم نگزارد کہ بشنود اغیار

(سعدی)

غیرت کے اس مقام میں آگے چل کر محب کو خود اپنی ذات پر غیرت آنے لگتی ہے، چنانچہ خواجہ شبلی نے اس طرح دعا کی تھی:

اللھم احشرنی اعمی، فانک اجلّ	بار الہا تو مجھے اندھا اٹھا، کیونکہ تو بزرگ و برتر ہے
واعظم من ان تراک عینی!	اس سے کہ میری آنکھیں تجھے دیکھیں

چنانچہ اس مفہوم کو امیر قاسم نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

زدل رشک آیدم، چوں بگذرد در دل خیالِ تو

چساں بینم کہ افتد چشم غیرے بر جمالِ تو

یعنی شاعر اپنے ہی دل کو اپنا غیر تصور کر رہا ہے اور اپنے محبوب کے خیال کا دل میں گزرنا بھی اس کو غیرت کے مارے گوارا نہیں۔ غیرت کی نفسیاتی وجہ کسی نے یہ بتلائی ہے:

زغیرت خلوتِ دل را ز غیرت کردہ ام خالی کہ غیرت را نمی زیبد دریں خلوت سرا رفتن

غیر تو ۱۲ غیر تو ۱۲

(۳) تیسرا درجہ اشتیاق ہے، اس مقام میں آتشِ شوق و آرزو بھڑک اٹھتی ہے اور بیچارہ بے اختیار ہو کر فریاد کرتا ہے :

مشتاقی و صبوری از حد گزشت یارا
گر تو شکیب داری طاقت نماند مارا

اے بے تو حرام زندگانی ‌ ‌ ‌ ‌ خود بے تو کدام زندگانی
بے روئے خوشِ تو زندہ بودن ‌ ‌ ‌ ‌ مرگیست بنام زندگانی

(۴) چوتھا درجہ ذکرِ محبوب ہے۔ چنانچہ مشہور بات ہے: من احبَّ شیئًا اَکثَرَ ذکرہٗ، یعنی جو شخص جس چیز کو چاہتا ہے اس کا اکثر ذکر کیا کرتا ہے۔
ایک عاشق بیمار ہوا، دوستوں نے پوچھا "کیا تمہارے لیے طبیب کو بلائیں؟" اس نے کہا: طبیبی ذِکرُ حبیبی!

اے نام تو ام شفا کے امراض
وز نام تو ام حصول اغراض

(۵) پانچواں درجہ تحیّر ہے۔ محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم نے باوجود اس جلالت شان کے فریاد کی: یا دلیلُ المُتحیّرِین! یعنی اے رہنمائے متحیرین! اور آخر میں دعا کی:

رَبِّ زِدْنِی تَحَیُّرًا ‌ ‌ ‌ ‌ اے رب میری حیرت کو اور زیادہ کر۔

محبوب بلند قدر ہو، اس تک پہنچنا محال ہو تو حیرت و دہشت کے سوا کیا حاصل ہو سکتا ہے؟

توی سلطانِ ملکِ حسن من بیچارہ درویشم
بجز حیرت دگر نبود نصیب جانِ بے خویشم!

III محبت کا تیسرا درجہ مودّت کہلاتا ہے اور وہ "ھیمان القلب و اتصافہ

بالھوی "یعنی دل قلب کا برانگیختہ ہونا اور خواہش سے متصف ہونا ہے (یعنی اس میں خواہش پیدا ہوتی ہے) اس کے بھی پانچ درجے ہوتے ہیں:

(۱) پہلا درجہ نیاحت واضطرار ہے، اس مقام میں نوحہ وزاری، فریاد وبیقراری ہوتی ہے:

در ہوائے تواے بتِ مہ روئے
می کند نوحہ بر تنم ہر موئے!

(۲) دوسرا درجہ گریۂ وبکا ہے. خود رسولِ عالمیاں کے متعلق کہا گیا ہے، کان علیہ السلام دائم الحزن والبکاء یعنی آپ ہمیشہ غمگین وگریان رہا کرتے تھے. اور اپنی دعا میں عرض کرتے اللھم ارزقنا عینا باکیۃ یعنی اے اللہ ہمیں چشم گریاں عطا فرما!

جاناں من از فراقِ تو چنداں گریستم
کیں آبِ چشم من ہمہ روئے زمیں گرفت
سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن
بیا در کشتیٔ چشم نشین وسیرِ دریا کن (صائب)

(۳) تیسرا درجہ حسرت، ہے، اس مقام پر پہنچ کر صاحبِ وداد اپنے ان اوقات پر حسرت کی نگاہ ڈالتا ہے جو ضایع گئے اور ہر لحظہ جو بغیر محبوب کے بسر ہوا اس پر نادم ہوتا ہے:

عمرے کہ بے تو می رود از مرگ بدتر است
روزے کہ بے تو بگذرد روزِ محشر است!

(۴) چوتھا درجہ محبوب کی فکر ہے، تفکر قرب محبوب کا موجب ہے، اسی لیے ایک ساعت کے تفکر کو ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر قرار دیا گیا ہے (تفکر ساعۃ خیر و

من عباد نو سنین سنۃ) کسی عارف نے اس خیال کو اس طرح شعر میں ادا کیا ہے:

نخواہم جز تو یک ساعت تفکر در دگر کردن
کہ در ہر دو جہاں جاناں ندارم چوں تو دلدارے

(۵) پانچواں درجہ مراقبہ محبوب ہے۔ یہ بہت بڑا مقام ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نماز پڑھی، لوگوں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ زرد ہو گیا، آپ بیہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش آیا تو فرمایا:

(راقبت اللہ فی صلوتی فاستحییت من تقصیری

میں نے نماز میں حق تعالیٰ کا مراقبہ کیا، مجھے اپنی تقصیر پر حیا آئی

(تفکر اور مراقبہ میں فرق یہ ہے کہ تفکر کا تعلق عقل سے ہوتا ہے اور مراقبہ میں لطیفہ روح پر محبوب کی تجلی ہوتی ہے)

17 چوتھے مرتبہ کا نام ہوا ہے، وَھُوَ اَنْ یَھْوِی الی المحبوب دائماً یعنی وہ محبوب کی طرف ہمیشہ مائل ہوتا یا آرزومند رہنا ہے۔ (آرزو ۱۲) اس مقام کے بھی پانچ درجے ہیں:

(۱) پہلا درجہ "خضوع" یعنی عاجزی و فروتنی جس کا قول ہے کہ "وصال یار کے لیے اس کے دروازہ پر عاجزی و فروتنی سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں (ما اعلم فی وصال احسن من الخضوع علیٰ بابہ)

یک جاں چہ متاعیست کہ سازیم فدایت
اما چہ تواں کرد کہ موجود ہمیں است

(۲) دوسرا درجہ اطاعتِ محبوب میں اوقاتِ حیات کا بسر کرنا ہے: نقدِ عمر کو راہِ یار میں صرف کرنا ہے:

مرا تا جاں بود عشقِ تو بازم   مرا تا سر بود گوئے تو سازم

ما نقدِ عمر صرفِ رہِ یار کردہ ایم
کارے کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

(۳) تیسرا درجہ شدائد و محن میں صبر ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے: اصبر و تجرّع البلوی من غیر شکوی یعنی صبر کر اور بلا کو بلا شکایت پی جا۔ عاشق کے لیے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں المحبوب یفعل مایشاء، محبوب جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ حدیثِ نبوی خبر دیتی ہے: اذا احب اللّٰہُ عبداً ابتلاہ، فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ، یعنی جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مبتلا کرتا ہے، اب اگر بندہ صبر کرتا ہے تو اس کو اپنا برگزیدہ بندہ قرار دیتا ہے (یعنی انواعِ نعمت سے سرفراز کرتا ہے جس میں بندہ کی سعی کو کوئی دخل نہیں ہوتا) اور اگر بندہ اس بلا سے راضی ہو جاتا ہے تو اس کو تمام ناشایستہ صفات و افعال سے پاک کر دیتا ہے۔ (یہی اللہ کی محبت ہے بندہ کے ساتھ) سچ کہا ہے کسی عارف نے:

جز صبر نیست صیقلِ دلہائے بیقرار
چوں ایستاد آب بآئینہ می رسد (مخلص کاشی)

(۴) چوتھا درجہ تضرُّع ہے یعنی عاجزی کرنا، گڑگڑانا ہے۔ قرآنِ حکیم حکم دیتا ہے ادعوا ربّکم تضرّعاً وّخفیۃً (پ ۸ ع ۱۴) اپنے رب کو عاجزی اور خوف کے ساتھ پکار

عاشقِ مہجور کی جب یہ حالت ہو جاتی ہے کہ نہ وصلِ یار اس کے امکان میں ہوتا ہے، نہ گلبنِ قرب کی ہوا اس تک پہنچتی ہے، نہ اس کے جسم میں طاقت آواز باقی رہتی ہے اور نہ روح میں قوتِ پرواز تو سوا تضرّع و زاری کے وہ کر بھی کیا سکتا ہے؟

چوں نیست دست زدرم و یارائے طاقتم
اینک رہِ تضرع و زاری گرفتہ ایم!

(۵) پانچواں درجہ رضا و تسلیم ہے۔ کسی عارف نے خوب کہا ہے:

شرط الرضا ان یکون العبد بین یدی مولاہ کالمیت بین یدی الغاسل یُقَلِّبُہٗ کیف یشاء	شرط رضا یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کے سامنے ایسا ہو جائے جیسا کہ مردہ غسّال کے آگے ہوتا ہے وہ اس کو جس طرف چاہے الٹتا پلٹتا ہے!

اے سرو بلند بوستانے　　در پیش درختِ قامتت پست
چشمت بکرشمہ خونِ ما ریخت　　بادات بحل (معاف ۱۲) زبانت (زاترا ۱۲) پیوست (ہمیشہ)
گر سر نہم بر آستانت　　دیگر چہ کنم دردِ گر ہست؟

۶ محبت کا پانچواں درجہ شَغَف ہے۔ شغف کا لفظ قرآنِ کریم میں عزیز کی بیوی کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے:

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (پ۱۲ ع۱۴) اس، غلام کا عشق اس کے دل میں جگہ کر گیا ہے۔

اس کے بھی پانچ درجے ہیں:

(۱) پہلا درجہ امرِ محبوب کی مطاوعت یا فرماں برداری اور اس کے حکم کا امتثال ہے خوشی سے اور بے اختیاری سے۔ قرآن عزیز حکم دیتا ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (پ۱۲ ع۱۰) جس طرح تجھ کو حکم ہوا اس پر قائم رہ۔

جانتے ہو کہ حکم کس امر کا ہوا ہے؟

تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔ (پ۲۹ ع۱۳) سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ رہ۔

مشغولِ ترا خبر ز عالم نبود　　مجروحِ ترا حاجتِ مرہم نبود
در عشق تو گر ہزار غم پیش آید　　چوں در نظر توام ازاں غم نبود

(۲) دوسرا درجہ غیر محبوب سے باطن کی محافظت ہے۔ کسی عارف عاشق کا قول ہے:

من حفظ باطنہ عن الاغیار ملاء اللہ قلبہ بالانوار، یعنی جو شخص اپنے باطن کی اغیار سے حفاظت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو انوار سے بھر دیتے

ہیں۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ "اللّٰہ وتر یحب الوتر" اللہ تعالیٰ یگانہ ہیں اور یگانگی ہی کو پسند فرماتے ہیں۔ اسی لیے سچے عاشق کی دعا یہی ہوتی ہے:

جز عشق تو عیشہا فراموشم باد
حزن تو بجائے جاں در آغوشم باد

"عش بی وَفِ قَلْبَكَ عن سوای" یعنی مجھ سے زندہ رہ اور اپنے قلب کو میرے غیر سے محفوظ رکھ" کے یہی معنی ہیں ؎

جز دوست نہ بینیم، ونخواہیم و نجوئیم
از خویش بگزشتیم، ز اغیار برستیم

(۳) تیسرا درجہ محبوب کے اعداء سے عداوت رکھنا ہے۔ اس کا ذکر "موافقت" کے معنی کی توضیح میں ہم نے اوپر کیا ہے۔

(۴) چوتھا درجہ محبوب کے دوستوں سے محبت ہے، چنانچہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں اس کا اظہار فرمایا ہے:

اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ اَحَبَّكَ،	میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور اس کی محبت کا جو تجھ سے محبت کرتا ہے۔

اور اپنے طریقے کو یوں ظاہر کیا ہے:

نحن نحب بحبك من اطاعك من خلقك	تیری محبت ہی کی وجہ سے ہم ان سے محبت کرتے ہیں جو تیری اطاعت کرتے ہیں۔

(۵) پانچواں درجہ "اخفائے احوال" ہے، جو عاشق و معشوق میں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ شبلیؒ کا قول ہے:

شَرطُ المَحَبَّۃِ كِتْمَانُ الاَحوال	محبت کی شرط حالات کا پوشیدہ رکھنا ہے،

اور کسی عارف نے کہا تھا:

لولا الدموع الفاضحة فکتمان الحال من منازل الرجال، یعنی اگر آنسو نہ ہوتے جو فضیحت کا باعث ہوتے ہیں تو احوال کا پوشیدہ رکھنا مردوں کے مراتب میں داخل ہے، کسی عاشق نے اپنا معاملہ یوں پیش کیا ہے:

غمت ہر چند می پوشم بدامن   فضیحت می کند چشمِ روانم
رخِ زردم ندارد طاقت ہجر   بروں می افگند رازِ نہانم

۷ محبت کا چھٹا مرتبہ "خلّت" کہلاتا ہے۔ خلّت کا لفظ تخلیہ سے ماخوذ ہے یعنی محبوب کا اس کے ماسوی سے خالی کرنا۔

(۱) اس کا پہلا درجہ "معاندت" ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ محب جس کسی مجلس میں بیٹھتا ہے اغیار سے پریشان خاطر ہوتا ہے، اور لوگوں کی ایذا رسانی سے ڈرتا ہے، لوگ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں اور درپے آزار ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت میں مصنف رسالۂ عشقیہ نے یہ آیت لکھی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ	ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا
رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى	جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو، کہ جب اس نے کچھ پڑھا
الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ	شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہ ڈالا۔ پھر اللہ تعالیٰ
مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ط	شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نیست و نابود کر دیتا ہے پھر
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ (پ ع ۱۲)	اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے، اللہ خوب حکمت والا ہے

اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ محب کے خلاف شیطان اور اس کے انصار اپنا محاذ تیار کرتے ہیں اور اس کو پریشان کرتے ہیں اور اس کو رسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عشق میں رسوائی ضرور ہوتی ہے۔ جیسا کہ سالک یزدی نے کہا ہے:

از پرید نہائے رنگ و از تپید نہائے دل   عاشقِ بیچارہ ہر جا ہست رسوا می شود

(۲) دوسرا درجہ صدق ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:۔

المحبۃ صداق والصادق حبیب اللہ ۔ محبت راست بازی ہے اور راست باز اللہ کا دوست ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (پ ۲۴ ع ۱) جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور اس کو سچ جانا تو یہ لوگ پرہیزگار ہیں۔

سعدیؒ نے کہا تھا:

راستی موجبِ رضائے خداست کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

(۳) تیسرا درجہ اشتہار ہے یعنی محب کی تشہیر، لیکن اس مقام میں محب اپنی انانیت یا خودی سے باہر نکل آتا ہے، وہ شہرت و خمو رسوائی میں فرق نہیں کرتا۔ محبوب اپنے محب کے حال کو شائع کرتا ہے اور شہرت دیتا ہے۔ کسی عاشق عارف نے خدا سے دعا کی:

اللّٰھم استرنی، فاجیب یا فلان الحق لا یستر مشیئا الٰہی مجھے پوشیدہ رکھ، اس کو جواب ملا کہ اے شخص، حق کو کوئی چیز پوشیدہ نہیں کر سکتی!

لیکن اس مقام میں بہت سی آفتیں ہیں!

(۴) چوتھا درجہ "شکوہ" ہے یعنی گلہ و شکایت۔ چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے کہا:

اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (پ ۱۳ ع ۴) میں تو اپنے رنج و غم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں۔

اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لک الحمد و الیک المشتکی تیرے ہی لیے تمام خوبیاں ہیں اور تجھ ہی سے گلہ و شکوہ ہے۔

محب اپنے محبوب کی شکایت کسی طرح کر سکتا ہے؟ لیکن وہ اپنی ذلت و مسکنت عجز و بے چارگی کا اظہار اسی کے سامنے کرتا ہے، غیر کے سامنے ہرگز نہیں کرتا اور

اسی کو شکوہ کہا جاتا ہے۔

پناہے بود ہر کسے را و بندہ
بجز آستانت پناہے ندارم!

جب حضرت ایوب علیہ السلام نے درد و بیماری کی حالت میں فریاد کی:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (پ۱۷ ع۶) — مجھ کو یہ تکلیف پہونچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

تو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا:

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ۔ (پ۲۳ ع۱۳) — بے شک ہم نے ان کو صابر پایا، اچھے بندے کہ بہت رجوع ہوتے تھے۔

عاشق کی شکایت بس اتنی ہے کہ آپ کے سوا میرا ہے کون جس کے سامنے اپنے درد دکھ کو پیش کروں:

ہر کسے در جہاں کسے دارد — من ترا دارم و ترا و ترا!!
ہیچ باب از یں در طریق رفتن نیست — کجا رویم ازیں در، کہ ہم در داریم؟
از دست تو ہم پیش تو فریاد کنم زانکہ — چوں جز تو نمی بینم فریاد رسے را

(۵) پانچواں درجہ "حزن" ہے۔ کہا گیا ہے۔

ان اللہ یحب قلبًا حزینًا الحدیث وقال جل ذکرہٗ — بیشک اللہ دوست رکھتا ہے اس قلب کو جو اس کے لیے محزون ہوتا ہے۔

انا عند المنکسرۃ قلوبہم لاجلی — میں ان قلوب میں ہوں جو میرے لیے ٹوٹے ہوئے ہیں،

عاشق کی دعا ہی یہ ہوتی ہے:

جز عشق تو عیشہا فراموشم باد
حزنِ تو بجائے جاں در آغوشم باد

VII ساتواں مرتبہ محبت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ نہایت شریف مرتبہ ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں

یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (پ ۶ ع ۱۲) اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں

سے ہوا ہے۔ اس کے بھی پانچ درجے ہیں :

(۱) پہلا درجہ حُسنِ اخلاق کا ہے جو خلا و ملا، یعنی تنہائی یا سوسائٹی میں ہو، یا شدت و رخا یا تنگی و فراخی میں ہو۔ یہاں محب کے اقوال و افعال، حرکات و سکنات تمام مستحسن و پسندیدہ ہو جاتے ہیں، اس کی آنکھیں دوست کے سوا کسی شے کو نہیں دیکھتیں، اور اس کا دل محبوب کے سوا کسی کو جانتا تک نہیں، ہر ایک سے کٹا ہوا ہوتا ہے بایں ہمہ جب وہ خلق کے ساتھ بیٹھتا ہے تو یہ جان کر کہ یہ اس کے محبوب ہی کی مخلوق ہے، مکارم اخلاق سے پیش آتا ہے۔ و ذالک من احسن الاخلاق و اشرف الاوصاف، گو وہ خلق کے درمیان ہوتا ہے اور ان سے حسن اخلاق سے پیش آتا ہے لیکن باطن میں وہ خلق سے منقطع اور اپنے محبوب ہی سے وابستہ ہوتا ہے، اس کا اصولِ کار یہ ہوتا ہے: کن جمعا نبیا دواحدا انیاً جمع و وحدت دونوں کا وہ جامع ہے، کسی عارف نے محبوب کی زبان سے کہلوایا ہے:

گر با ہمہ، چو با منی بے ہمہ
در بے ہمہ چو بے منی با ہمہ

(۲) دوسرا درجہ ملامت و اظہار شکر و حیرت کا ہے۔ اس مقام میں محب مدہوش ہوتا ہے اور محبت کے جام مالامال سے بیہوش، نہ فضیحت سے ڈرتا ہے اور نہ رسوائی سے خوف کرتا ہے، دیوانہ وار نکل پڑتا ہے اور مستانہ وار خرابات[1] کی راہ

[1] صوفیاء کی اصطلاح میں خرابات عالم معنی یا عارف کامل کے باطن سے مراد ہے۔ بعض صوفیا خرابات سے مقام وحدت مراد لیتے ہیں جہاں وہم دوئی بالکل محو ہو جاتا ہے۔

لیتا ہے،

عشق تو مرا خرابانی کرد

ورنہ من بیچارہ بساماں بودم

اس مقام میں نوازش بھی بہت ہوتی ہے اور جانکاہی بھی بہت زیادہ ہے، کبھی تو محمد مصطفےٰؐ سے کہا جاتا ہے:

لولاک لما اظہرت الربوبیۃ — اگر آپ نہ ہوتے تو میں ربوبیت کا اظہار نہ کرتا۔

اور کبھی ارشاد ہوتا ہے:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ أَوْحَیْنَا إِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا (پ ۱۵ ع ۹) — اگر ہم چاہیں تو جس قدر تجھ پر وحی بھیجی ہے سب سلب کرلیں، پھر اس کے لیے تجھ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے۔

کبھی موسیٰ کلیم اللہ سے کہا جاتا ہے:

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ (پ ۱۶ ع ۱۱) — میں نے تجھ کو اپنے لیے منتخب کیا۔

اور کبھی فرماتے ہیں:

لَنْ تَرَانِیْ (پ ۹ ع ۷) — تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔

کبھی آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْأَرْضِ خَلِیْفَةً (پ ۱ ع ۴) — ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب

اور کبھی کہا جاتا ہے:

وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی (پ ۱۶ ع ۱۶) — اور آدمؑ نے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے،

کبھی محب کا درجہ بڑھاتے ہیں، اور کبھی اس کو آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں، لیکن اگر محب کامل ہوتا ہے تو وہ کبھی محبوب سے اپنی نظر نہیں ہٹاتا اور اپنے تمام احوال میں مرادِ محبوب ہی کا مرید ہوتا ہے:

اگر مرادِ تو اے دوست نامرادیٔ ماست
مرادِ خویش ازیں بیش من نخواہم داشت

(۳) تیسرا درجہ مشاہدۂ غیوب کا ہے۔ اس مقام تک پہنچ کر محب صاحب مکاشفہ ہو جاتا ہے اور محبوب اپنے بعض اوصاف و احوال اس پر ظاہر کرتا ہے اور اس کے دل کو اپنی محبت کے انوار سے مملو کر دیتا ہے اور اس کے سر کو لوحِ محفوظ کے محاذی کر دیتا ہے۔ لیکن اس مقام میں مکر و افتنان بھی بہت ہیں، بہت سے سر خاک میں مل جاتے ہیں اور بہت سی جانیں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر محبوب کی عنایت دستگیری کرتی رہے اور محب اپنی آنکھیں غیر محبوب سے بند کرے اور

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی (پ ۲۷ ع ۵) نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی۔

کے مصداق قائم رہے تو دولتِ قابَ قوسین او ادنیٰ (پ ۲۷ ع ۵) عطا ہوتی ہے اور سعادتِ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ سے نوازا جاتا ہے ع

چو از جملہ بریدی من ترا ام

اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں:

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ (پ ۱۵ ع ۱۴) اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے ہو اور ان کے معبودوں سے مگر اللہ سے، تو تم غار میں چل کر پناہ لو۔

یہاں کہف سے مراد کہف الوصال ہے۔

(۴) چوتھا درجہ آرزوئے ملاقات کا ہے۔ محب اپنے خون میں ہزار بار نہائے اور بلا کی دار پر سینکڑوں مرتبہ کھینچا جائے، تاہم اشتیاقِ وصالِ محبوب اور اس کی ملاقات کی آرزو اس کے دل میں تیز تر ہوتی جاتی ہے، رد و قبول کا اندیشہ اس کے دماغ میں گزرتا نہیں، اگر لن ترانی کی ضرب اس کی جان پر ستر مرتبہ بھی لگائی

---

۱ دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا۔ ۲ کیا تو نے اپنے رب پر نظر نہیں کی۔

جائے وہ "ارنی انظر الیک" کی صدا بلند کرتا ہی رہے گا:

اگر بہ تیر زنندم وگر بہ تیغ کشند
بہ ہیچ ضرب و سیاست ز تو ندارم دست

(۵) پانچواں درجہ استیناس یعنی طلبِ انس و التماسِ لقا، بتلایا گیا ہے،

علامۃ المؤانسۃ بالحبیب التوحش عن غیرہ: محبوب سے انس (ملاقات) کی شناخت اس کے غیر سے وحشت ہے۔

اے پادشاہِ حسن خدا را بسوختیم
یکرہ سوال کن کہ گدا را چہ حاجت است؟

VIII آٹھواں مرتبہ عشق ہے۔ عشق افراطِ محبت اور شدتِ محبت کا نام ہے، یہاں عقل و ہوش رخصت ہو جاتے ہیں:

کتابِ حسن تو روزے قضا می خواند در گوشم
شدم از عشق بیگانہ نہ عقلم ماند نے ہوشم

عشق وہ آگ ہے جو خرمنِ وجود کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے اور نہالِ ہستی کو جڑ سے اکھیڑ پھینکتی ہے۔ خواجہ شبلیؒ نے کہا تھا: العشق نار یقع فی القلب فاحرقت ما سوی المحبوب[1]:

عشق آمد و خانہ کرد خالی
برداشتہ تیغ لاابالی
(بے پروائی ۱۲)

حاصلِ عشق ایں سخن بیش نیست
سوختم و سوختم و سوختم!

---

[1] عشق وہ آگ ہے جب قلب میں دہکتی ہے تو محبوب کے سوا ہر چیز کو جلا چھوڑتی ہے۔

ایمان بجز عشق کامل نہیں ہوتا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (پ ۲ ع ۴) — اور جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔

محبت ہی جب شدید ہو جاتی ہے اور نہایت قوی ہو جاتی ہے تو عشق کہلاتی ہے:
(والمحبۃ إذا اشتدت وقویت سمیت عشقاً)

لیکن عشق "آمدنی" ہے "آوردنی" نہیں:

وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (پ ۲ ع ۱۷) (اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں دیں)

ہجویری کے الفاظ میں: "عشق از مواہب است نہ از مکاسب" (کشف المحجوب)
غالب نے اس حقیقت کو یوں ادا کیا تھا:

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز فرماتے ہیں: "عشق وہبی صرف است و بخششے خاصہ است" (اسمار الاسرار). ان ہی کا شعر ہے:

عشق بازی اختیاری نہ بود
ہر کرا خواہند بر سر می نہند

تمام صوفیہ محبت و عشق کے وہبی ہونے کے قائل ہیں۔
عشق کے پانچ درجے ہیں:

(۱) درجۂ اول "فقدانِ دل" ہے چنانچہ مشہور بات ہے:
من لیس بمفقود القلب لیس بعاشق، جو گم کردہ قلب نہ ہو وہ عاشق نہیں:

زدلم نشاں چہ خواہی کہ زدل خبر ندارم
تو بگو کہ دل چہ باشد من از و اثر ندارم!

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص دل رکھتا ہے وہ دل کی خبر رکھتا ہے اور عشق سے بے خبر رہتا ہے:

کہ گفت من خبرے دارم از حقیقتِ عشق
دروغ گفت کہ از خویشتن خبر دارد!!

ذوالنون مصریؒ سے پوچھا گیا کہ عاشق صادق کون ہے؟ فرمایا:

اذا رأیت رجلاً مضطرب الوجہ، مفقود القلب، مغلوب العقل، شدید البکاء، طالب الموت والفنا ومع ذالک یراعی الادب ویتفق الاوقات فھو عاشق صادق۔

جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جو پریشان صورت دل کھویا ہوا، مغلوب العقل، بہت رونے والا، موت کا طالب، فنا کا مشتاق اور اس کے باوجود ادب مرعی رکھتا ہو اور پابند اوقات ہو تو سمجھ لو کہ وہ عاشق صادق ہے۔

(۲) دوسرا درجہ تاسف ہے۔ عاشق بے دل اس مقام میں بے معشوق ہر دم اپنی زندگی پر افسوس کرتا ہے۔ حضرت یعقوب کا حال قرآنِ حکیم نے یوں بیان کیا ہے:

یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنٰہُ مِنَ الْحُزْنِ فَھُوَ کَظِیْمٌ۔ (پ ۱۳ ع ۴)

کہنے لگے ہائے یوسف افسوس! اور غم سے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ گھٹا کرتے تھے۔

ہر لحظہ کہ بے تو مرا می رود عمر
واللہ از آن حیات مرا مرگ خوشتر است
بے روئے تو زندہ می تواں بود ولیک
آں زندگی از ہزار مردن بتر است

(۳) تیسرا درجہ وجد ہے۔ اور وجد ایک ایسا عجیب حال ہے کہ نہ زبان اس کا بیان کر سکتی ہے نہ قلم! صاحبِ وجد کے لیے تمام دنیا حلقۂ خاتم کی طرح تنگ ہو جاتی ہے، بلکہ عالمِ ملکوت کی وسعت بھی اس کی نظر میں حقیر معلوم ہوتی ہے اس کو نہ کسی جگہ آرام ملتا ہے نہ کسی مقام قرار!

(۴) چوتھا درجہ بے صبری ہے۔ اس مقام میں عاشق کی طاقت جواب دے دیتی ہے

اور اس کی جان اشتیاق یار میں جل جاتی ہے، آتشِ شوق اس کو جوش میں رکھتی ہے اور وہ شب و روز خروش میں مصروف رہتا ہے :

تا بود مرا طاقت، بودم بہ شکیبائی — چو کار بجاں آمد، زیں پس من و رسوائی

سر پنجۂ صبر را بپیچید و بروں شد دل — اے صبر ہمیں بود ت بازوئے توانائی؟!

سچ کہا ہے کسی عاشق نے : العشق والصبر ضدان لا یجتمعان، عشق و صبر ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہ دو ایک جا جمع نہیں ہو سکتے :

دلے کہ عاشق صابر بود مگر سنگ است

ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

(۵) پانچواں درجہ صیانت ہے۔ اس مقام میں عاشق کی حالت ایک دیوانے کی سی ہوتی ہے، اس کی آنکھیں گریاں، دل بریاں، ہر گلی کوچے میں رواں دواں ہوتا ہے اور ہر صحرا میں پویاں و جولاں! محبوب کے سوا کسی چیز کو نہیں جانتا، معشوق کے نام کے سوا کوئی لفظ اس کی زبان پر نہیں آتا، جنون میں سنگ و گیاہ سے گفتگو کرتا ہے اور نسیمِ صبا کو پیغام دیتا ہے۔ اہلِ عشق معشوق کی بو ہی سے زندہ ہوتے ہیں اور معشوق کا نام لے کر ہی وہ قبر سے اٹھتے ہیں ع از بہر تو میرم و برائے تو زیم،

بوئے محبوب چو بر خاک احبا گزرد

چہ عجب گر بشود زندہ از و عظم رمیم

(بوسیدہ ہڈی ۱۲)

IX نواں مرتبہ تیم[1] کہلاتا ہے۔ اس مقام میں عجز و بندگی کا طوق عاشق کی گردن میں ڈالا جاتا ہے اور بیچارگی و غلامی کی زنجیریں اس کے پاؤں میں پہنائی جاتی ہیں۔ اس کے بھی پانچ درجے ہیں :-

[1] تیم یا تَیَّم : غلام بنا دینا، تابعدار کر دینا۔ متیم محبت کے دام میں گرفتار، ذلیل و خوار۔ کعب بن زہیر کے قصیدے میں "مُتَیَّم اِثرَہا لَم یُفدَ مَکبُولُ" آیا ہے۔

(۱) پہلا درجہ "تفرّد" کہلاتا ہے۔ اس منزل میں دوست غیرِ دوست سے مجرّد ہو جاتا ہے، اس کو اپنے محبوب سے اتحاد حاصل ہو جاتا ہے۔

در خویش گُم کہ من چہ نامم
معشوقم و عاشقم، کدامم؟

اس جا عاشق اپنی خودی سے فارغ ہو جاتا ہے:

حدیثِ من و رقیے باز کن کہ من نہ منم
ہمہ تو گشتم و اینک حدیث شد کوتاہ

یہاں عاشق و معشوق ایک ہو جاتے ہیں، تعدّد رفع ہو جاتا ہے۔ (بمعنی انگور)[1]

عاشق و معشوق و عشق ہر سہ یکے داں در اصل
فرق میانِ من و تو ہست حقیقت ہو است

مولانا روم نے فرمایا تھا: "عاشق محو در عشق و عشق محو در معشوق"

منصور حلاج کا یہ شعر مشہور ہے:

انا من اھوی و من اھوی انا
نحن روحان حللنا بدنا

مقامِ تفرّد ہی میں حلاج کی زبان سے یہ چیخ نکلی:

لَوْ اَنْتَ اَمْ اَنَا ھذا العین فی العین
حاشای حاشا من اثبات اثنین![1]

اس جگہ غیرتِ معشوق

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (پ ۲۷ ع ۱۱) جتنے روئے زمین پہ موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور آپکے پروردگار کی ذات جو عظمت و احسان والی ہے باقی رہ جاۓ گی

[1] تو ہو یا میں دونوں ایک ہیں، دوی کے اثبات سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔

کی تجلی کرتی ہے اور غیریت کے حجاب کو چاک کردیتی ہے!

عشق وعاشق محو گردد زیں مقام
خود ہماں معشوق ماند والسلام

(۲) دوسرا درجہ استتار ہے۔ اس مقام میں پوشیدگی چاہی جاتی ہے، اور یہ ہر دو جہت سے مطلوب ہوتی ہے، یہاں غیرتِ معشوق عاشق کی غیرت سے زیادہ ہوتی ہے۔ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اناغیور واللہ اغیر منی — میں غیرت دار ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت دار ہے۔

پس معاملہ یہ ہوتا ہے:

دل پیش توام دیدہ بجائے دگرستم
تا خلق نداند کہ ترا می نگرستم

یہ عجیب مقام ہے، پیغمبر علیہ السلام نے حقیقۃ الحقائق کی خبر رمز و اشارت ہی کی زبان میں دی ہے:

رازیست مرا باشب و سریست عجیب
شب داند و من دانم و من دانم و شب

آلم: المص اور دوسرے مقطعات بھی اسی قسم کے اشارات ہیں:

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی — پھر اللہ نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانی تھی۔ (پ۲۷ ع۵)

(۳) تیسرا درجہ بذلِ روح کا ہے یعنی جان کی بازی لگانے کا، اس منزل میں جان کا کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ کسی عاشق کی زبان سے اسی منزل میں یہ کلمات نکلے ہیں:

از من گماں مبر کہ دل از دوست بر کنم — تا جاں دریں تن است دم از عشق بر زنم

گر بشنوی کہ قافلہ مرد در غمت — اوّل کسے کہ جاں دہد از بہر تو منم

(۴، ۵) چوتھا و پانچواں درجہ خوف و رجا کا ہے۔ اس مقام میں عاشق قطعِ محبت کے خوف سے لرزاں رہتا ہے اور امید وصال سے شاداں۔ عاشق حق تعالیٰ کی صفات جبّاری، عزّت و استغنا کو پیش نظر رکھ کر خوف یہ کھاتا ہے کہ اس کا دل کہیں عشق الٰہی سے کسی آن اس کے غیر کی طرف منتقل نہ ہو جائے، کہیں معشوق حقیقی اس کے کسی فعل سے ناراض نہ ہو جائے! ظاہر ہے کہ جو شخص کسی چیز سے شدید محبت رکھتا ہے وہ اس کے جاتے رہنے سے خائف بھی رہتا ہے، اب اگر محبوب ایسا ہو کہ اس کا جاتا رہنا ممکن ہو تو محب کو خوف ضرور ہوگا۔ عارفین کا قول ہے کہ جو شخص حق تعالےٰ کی عبادت صرف محبت ہی کی اساس پر کرتا ہے۔ اور اس سے ڈر اور خوف چھوڑ دیتا ہے تو وہ نازکی وجہ سے اور زیادہ پاؤں پھیلانے کے سبب سے ہلاک ہو جاتا ہے، اور جو شخص صرف خوف کی وجہ سے عبادت کرتا ہے اور محبت نہیں رکھتا، وہ اس سے متوحش ہو کر بعید ہو جاتا ہے اور کٹ جاتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو حق تعالیٰ کی عبادت محبت اور خوف دونوں ہی کی وجہ سے کرتا ہے، حق تعالےٰ اس کو اپنا محبوب اور مقرّب بنا لیتے ہیں۔ لہذا محب کو خوف ضروری ہے اور خائف کو محبت! الایمان بین الخوف والرجا کے یہی معنی ہیں:

کہ ترسد ز بے نیازیٔ او

کہ نازد ز کارسازیٔ او؟

(۱۰) دسواں مرتبہ۔ ولَہ[1] کہلاتا ہے۔ اس مقام میں عظیم الشان خطرات ہیں، چنانچہ کہا گیا ہے:۔

---

[1] ولہ کے لغوی معنی حیران ہونا، ڈرنا، محبت و عشق میں دیوانہ ہو جانا ہیں۔ کہتے ہیں وَلَّہٗ قلوبہم یعنی ان کے دلوں کو دیوانہ کرنا۔

فی البعد تعذیب و فی القرب حیرۃ   دوری میں عذاب اور قرب میں حیرت ہے۔

اس مفہوم کو عاشق کی زبان میں سمجھو:

گر ہمت جاں میسر شود در تنگرم خود چوں زیم

حیرانم اندر کار خود کت جاں دہم یا ننگرم

شیخ احمد غزالی نے اپنے رسالہ "سوانح" میں لکھا ہے کہ معشوق ہر حال میں معشوق ہے لہذا استغنا راس کی صفت ہے۔ اور عاشق ہر حال میں عاشق ہے لہذا افتقار یا احتیاج اس کی صفت ہے۔ یعنی عاشق کو ہمیشہ معشوق کی ضرورت ہے اس لیے افتقار ہمیشہ اس کی صفت رہے گی اور معشوق کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، لامحالہ استغنا اس کی صفت رہے گی۔ اسی مفہوم کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے:

ہموارہ تو دل ربودۂ معذوری   غم ہیچ نیازمودۂ معذوری

من بے تو ہزار شب بخوں در بودم   تو بے تو شبے نبودۂ معذوری

یعنی ذات معشوق، بے ملاحظہ وصف معشوقیت، عاشق کی محتاج نہیں، ہاں وصف معشوقی کا لحاظ کیا جائے تو وہ بھی عاشق و عشق کی محتاج سمجھی جا سکتی ہے، لیکن معشوق فی نفسہ ثابت ہے اور اس کو اپنے وجود کے ثبوت میں کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ عاشق کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ خواجہ ابوالوفا خوارزمی فرماتے ہیں، کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ کی حدیث قدسی کو پیش نظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت احدیت کے کارخانہ محبت میں عارفوں اور محققوں کا بھی کام ہے اور آیت قرآنیہ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب صمدیت کے حریم مودت میں محبوں و عاشقوں کی بھی قدر یا اعتبار ہے لیکن طمع خام کو سر سے دور کرنا ہی بہتر ہے کہ وہ غیر کی پرواہ نہیں کرتا:

آئینہ در روئے خود می داشتہ است   تا بخود عاشق زار آمدہ است

او ز جملہ فارغ ست و ہر کسے اندریں دعوی پدیدار آمدہ ست
اوست عاشق، اوست معشوق، اوست عشق کیستی تو جملہ چوں یار آمدہ است

اب حیرت و دہشت کے سوا کیا رہ جاتا ہے:

حیرت اندر حیرت است و واِلٰہی در واِلٰہی
اندریں رہ صد ہزاراں عقلِ عاقل مبتلا است

اس مرتبہ کے بھی پانچ درجے ہیں:

(۱) پہلا درجہ سوال کا ہے جو محبوب سے تضرع و ابتہال کی زبان سے کیا جاتا ہے۔ جانتے ہو کہ معشوق سے معشوق کے سوا کوئی اور سوال نہیں کیا جاتا۔ افسوس اس عاشق کے حال پر جو معشوق سے معشوق کے سوا کسی اور چیز کا سوال کرتا ہے، وہ صحیح معنی میں عاشق ہی نہیں، عاشق کا منتہائے طلب تو صرف معشوق ہی ہوتا ہے: "ایک منتہی کلطبی" اس کی چیخ ہوتی ہے:

مرا لبان تو باید شکر چہ سود؟
بجائے یادِ تو یادِ دگر چہ سود؟

انتہائے بیچارگی کی حالت میں وہ چیختا ہے:

من چوں نہ ہم کہ روئے دگر خوش نمی کند
ایں چشم رو سیہ کہ بروئے تو خو گرفتست

(۲) دوسرا درجہ شرابِ سلسبیلِ عشق کا پینا ہے۔ اس مقام میں عاشقوں کے مذاہب و مشارب مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اس شراب کو کاسۂ درد میں نوش کرتے ہیں اور بعض کاسۂ اشتیاق میں، اور کہتے ہیں:

شربتُ الحبَّ کاساً بعدَ کاسٍ
فما نفدَ الشرابُ وما رَویتُ

(یعنی محبت کی شراب کے پیالے پر پیالے میں نے نوش کیے : شراب ختم ہوئی اور نہ میں سیراب ہوا)
اور بعض اس کو حزن کے پیالے میں پیتے ہیں اور بعض تاسف اور سختی کے پیالے میں،
بعض خوف کے پیالے میں اور بعض رجا کے پیالہ میں، اس طرح ہر ایک ایک حزن و
آفت میں مبتلا ہوتا ہے جس کی تشریح (امید) کی جائے تو یہ مختصر مطول ہو جائے۔

(۳) تیسرا درجہ سُکر (بیہوشی) ہے۔ چنانچہ کسی عارف کا قول ہے : من سکر بکاس المحبۃ
لا یصحوا الا بمشاھدۃ محبوبہ، یعنی جو شخص کہ ساغر محبت سے مست ہو اوہ
مشاہدۂ محبوب ہی سے ہشیار ہو گا۔ واقعہ یہ ہے :
المحبۃ سکرۃ فی حیرۃ وحیرۃ فی سکرۃ والمحب سکران، محبت بیہوشی ہے
حیرت میں اور حیرت ہے بیہوشی میں اور محب مست ہوتا ہے، اسی واسطے مانگنے والوں
نے مانگا تھا:

اے ساقی ازاں مے کہ دین و آئین من است
بے خویشم کن کہ مستی آئین من است

(۴) چوتھا درجہ اضطراب و بیخودی کا ہے۔ کسی عاشق کے متعلق کہا جاتا ہے
کہ تنہائی میں رو رہا اور چیخ رہا تھا : آگ، آگ، لوگ دوڑے دیکھا کہ آگ تو موجود
نہیں، پوچھا آگ کہاں لگی ہے ؟ بہت رویا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر
بولا :

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ۔ (پ ۲۲ ع ۲۹) — (وہ اللہ کی آگ جو سلگائی گئی ہے جو دلوں تک جا پہنچتی ہے۔)

عاشق کی بیماری طویل ہوتی ہے، اور شفائے علیل لقائے خلیل ہی سے ممکن
ہے، محبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ محب کو ہمیشہ تعب و اضطراب میں رکھے اور انواع
اسقام میں مبتلا کرے :

خاصیتِ سیماب بود عاشق را
تا کُشتہ نگردد اضطرابش نرود (فیضی)

کردار دایں چنیں عیشے کہ در عشق تو دارم
شرابم خوں، کبابم دل، ندیمم درد، نقلم غم

(۵) پانچواں درجہ تلف ہے۔ کسی عارف سے منازلِ عشق کے متعلق سوال کیا گیا، کہا:

اولہا بذل والرضا بالقتل — اس کی ابتدا صرف کرنا اور قتل پر راضی
نفس ما بعد ہٗ۔ — ہونا ہے، بعد کی حالت کا قیاس کر لو۔

در رہِ عشق، تواضع نبود غیرِ فنا!
دست برداشتن از خویش سلام اینجاست

اب عاشق مرتبۂ فنا تک پہنچتا ہے اور فنا سے بھی فانی ہو جاتا ہے، اور اس فنا میں بقائے ابدی وحیاتِ سرمدی پا لیتا ہے۔ قرآنِ کریم کا اشارہ ہے:

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ — وہ وہاں بجز پہلی موت کے اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے
الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (پ۲۵ ع۱۶) — اور اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا۔

تا مرد زخود فانیِ مطلق نہ شود — اثبات ز نفیِ او محقق نہ شود
از خویش بروں آی کہ او تو باشی — ورنہ بگذاف آدمی حق نہ شود
(بیہودہ گوئی ۱۲)

اسی مقام میں محبت کی تعریف سمجھ میں آتی ہے:

المحبۃ محو الحبیب بصفاتہ — محبت یہ ہے کہ محب اپنی تمام صفات کی نفی کرے
واثبات المحبوب بذاتہ — اور ذات محبوب کا اثبات کرے۔

یعنی اب محب اپنی صفت سے قائم نہیں ہوتا بلکہ ذات محبوب ہی سے باقی رہتا ہے، کہتے ہیں کہ کسی نے دیکھا کہ مجنوں نے اپنا نقش اور لیلیٰ کا نقش ایک ساتھ زمین پر بنایا اور پھر لیلیٰ کے نقش کو مٹا دیا۔ پوچھا گیا کہ یہ خوب عشق ہے کہ محبوب کے نقش ہی کو

مٹا دیا جاتا ہے، جواب میں مجنوں نے کہا: "اگر لیلیٰ کو تم مجھ میں نہ پاؤ تو پھر اس کا نقش علیحدہ بنا لو!" اسی واقعہ کو شاعر نے یوں ادا کیا ہے:

چوں عاشق را کسے بکاود

معشوق از و بر دل آرد

عاشق کا وجود معشوق کے وجود ہی سے قائم و ظاہر ہے، خود اس کا کوئی علیحدہ و مستقل وجود ہی نہیں:

من آنگہ خود کسے باشم کہ در میدانِ حکم او

نہ دل باشم نہ جاں باشم نہ سر باشم نہ تن باشم

عاشق کی بقا معشوق ہی کی بقا سے ہے، وہ فانی زخویش و باقی بہ معشوق ہے:

چو ہست بقائے من باقی بہ بقائے تو

پس ہم تو ہماں باقی خود را چہ بقا خواہم

محبت کے مراتب و درجات کی اوپر ہم نے جو تفصیل پیش کی ہے اس کو اگر امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ محب صادق جذبِ محبت کے زور سے خود کو محبوب میں کلیتہً ضم کر لیتا ہے، اپنی جان و تن کو محبت کی راہ میں صرف کرتا ہے اور ظاہر و باطن کی پوری قوت سے محبوب کو طلب کرتا ہے اور بغوائے مَنْ طَلَبَ شَیْئًا وَجَدَ وَجَدَ اپنی طلب میں کامیاب ہوتا ہے اور مَنْ طَلَبَنِی وَجَدَنِی کا وعدہ پورا ہوتا ہے! حضرت ابن عباسؓ نے حاکیاً عن اللہ تعالیٰ کہا تھا:

اَنَا الموجود فَاطْلُبْنِیْ تَجِدْنِیْ

فَاِنْ تَطْلُبْ سِوَای لَمْ تَجِدْنِیْ[1]

اسی لیے صوفیاء کرام نے راہِ عشق کو اقرب الطریق قرار دیا ہے۔ اس پر ہم

---

[1] میں موجود ہوں مجھے طلب کر، تو مجھے پائے گا، اگر تو میرے سوا کسی اور کو طلب کرے مجھے ہرگز نہ پائے گا۔

آگے چل کر تفصیل سے بحث کریں گے اور بتلائیں گے کہ سیر و سلوک الی اللہ بے عشق میسر نہیں ہوتا۔

محبت یا عشق کے مفہوم کی تعیین میں جو کچھ اب تک عرض کیا گیا ہے وہ کسی حد تک ان کے تضمنات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، لیکن یہاں ہم اکابر صوفیاء کے ان اقوال کو پیش کرنا مفید سمجھتے ہیں جو ان کے خیال میں محبت یا عشق کے معنے کو متعین کرتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے نزدیک عشق سے مراد عشق الٰہی ہے، اللہ تعالےٰ ہی محبوب حقیقی ہیں! لا محبوب الا اللہ!

(۱) حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ [۱] سے پوچھا گیا کہ محبت کیا ہے؟ فرمایا:

کاسٌ لہا وھجٌ اذا استقر	ایک پیالہ ہے (آگ کا) جو خوب بھڑکتا ہے،
فی الحواس وسکن فی النفوس	جب حواس کے اندر قرار پکڑتا ہے اور نفوس
تلاشت	میں قائم ہو جاتا ہے تو فنا کر دیتا ہے۔

یعنی تمام وجود کو محو کر دیتا ہے اور اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ قرار پکڑ لے اور جلد منطفی نہ ہو جائے یا بجھ نہ جائے جیسے بجلی کا حال ہے کہ ایک آن کے لیے چمکتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ شبلیؒ کا خیال ہے کہ محبت کا نام محبت اس لیے ہوا ہے کہ وہ دل سے ماسوائے محبوب کو محو کر دیتی ہے۔

(۲) حضرت بایزید بسطامیؒ [۲] نے محبت کی اس طرح تعریف کی ہے:

---

[۱] مرید خاص شیخ جنید بغدادیؒ، جنیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہر قوم کا ایک تاج ہوتا ہے اور اس قوم (قوم صوفیہ) کا تاج شبلی ہیں۔ مالکی المذہب تھے۔ وفات شب جمعہ، ۲۷ ذی الحجہ، ۳۳۴ھ مدت عمر ۸۸ سال، مزار بغداد میں ہے اور اس پر لکھا ہے: جعفر بن یونس " (یہی ان کا نام تھا)

[۲] آپ کا لقب سلطان العارفین اور نام طیفور بن عیسٰی بن آدم بن سروشان تھا۔ آپ کے دادا گبر تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ کا وطن بسطام ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنیدؒ نے فرمایا تھا کہ ہمارے درمیان بایزید ایسے ہیں جیسے فرشتوں کے درمیان جبریل۔ آپ کی وفات ۱۵ شعبان ۲۶۱ھ یا بقول دیگر ۲۳۴ھ میں ہوئی، قبر بسطام میں ہے۔

المحبة استقلال الكثير منك	محبت یہ ہے کہ اپنے کثیر کو قلیل جانیں اور محبوب
واستکثار القلیل من حبیبك	کے قلیل کو کثیر سمجھیں۔
ع اَلطَّلُّ مِنَ الْحَبِیْبِ وَابِلُ	ع: محبوب کی طرف سے ہلکی پھوار بھی زوردار بارش کے برابر ہوتی ہے

چنانچہ عزیر علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے وحی فرمائی:

إنّ من شرط المحبة ان تستقلل	بیشک شرط محبت یہ ہے کہ اپنی کثیر عبادت کو قلیل
کثرة عبادتك فان لی مثلك	سمجھ، تیرے مانند میرے ہاں بہت سے ہیں اور
کثیر وتستکثر قلیل فضلی فان	میرے تھوڑے فضل کو بھی زیادہ سمجھ نے کیونکہ
لك لیس مثلی	تیرے لیے مجھ جیسا کوئی نہیں۔

اسی مفہوم کو کسی عارف نے یوں ادا کیا ہے:

اگرچہ اندک بود انعام تو باشد بسیار
ورچہ بسیار کنم شکرِ تو باشد اندک!

(۳) حضرت شیخ ابو القاسم جنید بغدادی[1] نے فرمایا:

المحبة دخول صفات المحبوب	محبت صفاتِ محبوب کا بطور بدل صفاتِ محب
علی البدال من صفات المحب.	میں داخل ہونا ہے۔

یہاں بات ختم ہو گئی ہے، کیونکہ حقیقت میں محبت وہ رابطہ اتحاد ہے جو محب کو محبوب سے باندھ دیتا ہے اور جذباتِ محبوب سے وہ جذبہ ہے جو محب کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور جس قدر اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی قدر اس کے وجود سے کچھ محو کر دیتا ہے،

[1] سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ابو القاسم، لقب سید الطائفہ وطاؤس العلماء تھا۔ مذہب سفیان ثوری رکھتے تھے، شیخ سری سقطیؒ کے مرید کامل اور بھانجے تھے، آپ سلطان طریقت وپیشوائے اہل حقیقت ومقتدائے زماں تھے اور صوفیہ کے ائمہ اور سادات میں سے تھے اور حارث محاسبی کے ہم صحبت تھے۔ آپ کو سید الطائفہ اور امام ائمہ مانا گیا ہے۔ طریقت میں آپ کا کلام حجت ہے۔ سب کے نزدیک مقبول ہیں آپ کا طریقہ صحو پر مبنی ہے۔ وفات ۲۷ رجب ۲۹۷ھ۔

اس طرح اول تو وہ محب کی ساری صفات کو قبض کر لیتا ہے اور پھر اس کی ذات کو بھی اپنے قبضۂ قدرت میں لے لیتا ہے اور اس کی بجائے ایسی ذات اس کو عطا کرتا ہے جو اپنی صفات سے موصوف ہونے کی قابلیت رکھتی ہے، اب اس ذات بدل میں محبوب کی صفات داخل ہوتی ہیں۔ یہ بات اس لیے سمجھ میں آتی ہے کہ علی البدل کہا گیا ہے علی المحب نہیں کہا گیا، کیونکہ جب تک کہ محب اپنی ذات سے موجود ہوتا ہے صفاتِ محبوب سے متصف ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا، فافہم وتدبّر:

حضرت جنیدؒ کے اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی ادا کیا گیا ہے:

المحبة محو الحبیب بصفاته — محبت یہ ہے کہ محب کی ساری صفات محو ہو جائیں

واثبات المحبوب بذاته — اور محبوب کی ذات کا اس کی جگہ اثبات ہو۔

یہ فنا در محبت کا مقام ہے، یہاں وارد محبت محب کو محبوب میں فنا کر دیتا ہے، جیسے آگ جب شمع کو لگ جاتی ہے تو شمعیت کی صفت کو محو کر دیتی ہے

پروانہ چوں در آتش انداخت سوخت خود را
گوید کہ آتشم لیک از زبانِ آتش

کہا جاتا ہے کہ جب مجنوں کا عشق درجۂ کمال کو پہنچ گیا تو اس سے کسی نے کہا: "دیکھ وہ لیلیٰ آ رہی ہے!" مجنوں حالت استغراق میں تھا چونک پڑا اور بولا: "میں ہی تو لیلیٰ ہوں، لیلیٰ مجھ ہی میں تو ہے!"

بودیم انا لیلی یکے، دومی نمودیم
نا بود شد آن نمود در بود

ہوتا یہی ہے:

عشق و عاشق محو گردد دریں مقام
خود ہماں معشوق ماند والسلام

یہی معنی ہیں حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے اس قول کے :

اَلْمُحبۃُ حِجَابٌ بین الْمُحبّ والمحبوب، فاذا افنی المحب عن الْمَحبّۃ وَصَلَ بالمحبُوب۔ محبت خود محب و محبوب کے درمیان ایک پردہ ہے جب محب محبت سے فنا ہو جاتا ہے تو محبوب میں واصل ہو جاتا ہے۔

کسی عارف کا قول ہے : حُب دو حروف سے مرکب ہے، ح و ب، ح سے اشارہ روح کی طرف ہے اور ب سے مراد بدن ہے. یعنی جو شخص محبت کے راستے میں قدم رکھتا ہے وہ جان اور تن دونوں کو فدا کر دیتا ہے اور فنا فی المحبوب ہو جاتا ہے!

حسین بن منصور حلاج کا یہ قول بھی اس معنی کی تعبیر ہے :

حقیقۃ المحبۃ قیامك مع محبوب بخلع اوصافك محبت کی حقیقت یہ ہے کہ تو اپنے اوصاف کو چھوڑ کر محبوب کی ذات سے قائم ہو جائے۔

حضرت سری سقطیؒ کا یہ قول بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے :

لاتصلح المحبۃ بین الاثنین حتی یقول الواحد للآخر یا انا دو شخصوں میں محبت اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایک، دوسرے سے کہے: "اے میں!"

حضرت ابو عبد اللہ قرشیؒ نے بھی اسی طرح محبت کی حقیقت بیان کی ہے :

حقیقۃ المحبۃ ان تھب کلك لمن احببت ولا تبقی لك منك شیئًا۔ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ تو محبوب کے سپرد اپنا کل وجود کر دے اور اپنے لیے کوئی چیز نہ چھوڑے۔

براہِ عشق قدم چوں نہی مجرد شو!
برہنگی بود اسباب رہ شناور را (محمد علی اسلم)

حضرت ابو علی روزباریؒ نے محبت کے متعلق فرمایا :

مالم تخرج من کلیتك لم تدخل فی حد المحبۃ۔ تا وقتیکہ تو اپنی ذات سے بالکل باہر نہ آئے محبت کی حد میں داخل نہیں ہو سکتا۔

(۱) حاشیہ صفحہ ۵۶ پر دیکھیے۔

(۴) خواجہ عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ نے محبت کی اس طرح تعریف کی ہے:

المحبۃ معانقۃ الطاعۃ و مباینۃ الحاجۃ۔	محبت طاعت کا اختیار کرنا اور حاجت سے جدا ہونا ہے۔

کسی جگہ یوں بھی آیا ہے:

المحبۃ معانقۃ الطاعات ومباینۃ المخالفات۔	محبت اطاعت کا اختیار کرنا اور مخالفت سے بچے رہنا ہے۔

اسی طرح رویمؒ نے محبت کی تعریف کی ہے:

الموافقۃ فی جمیع الاحوال	تمام حالات میں محبوب کے ساتھ موافقت کرنا محبت ہے۔ یا
یا موافقۃ الحبیب فی المشھد والمغیب	محبوب کے ساتھ موافقت ہو حاضر و غائب ہر حال میں،

ولو قیل لی مُت مُتُّ سمعاً وطاعۃً
وقلت لداعی الموت اھلاً ومرحباً[۱]

اور ابوبکر کتانیؒ نے کہا تھا:

المحبۃ ایثار المحبوب علی جمیع المصحوب	محبت محبوب کا اختیار کرنا ہے سب کو چھوڑ کر۔

ان تمام تعریفات کا ماخذ حضرت شبلیؒ کا یہ قول نظر آتا ہے:

المحبۃ ایثار ما یحب المحبوب وان کرھت، وکراھۃ ما یکرہ المحبوب وان احببت	محبت اس چیز کا اختیار کرنا ہے جس کو محبوب دوست رکھتا ہے اگرچہ کہ وہ مکروہ ہو اور اس چیز کو مکروہ سمجھنا جس کو محبوب مکروہ سمجھتا ہے اگرچہ کہ وہ تجھے پسندیدہ نظر آئے۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) [۱] حضرت شیخ سری بن المفلس السقطی قدس سرہ کی کنیت ابوالحسن ہے، آپ حضرت شیخ معروف کرخیؒ کے مرید تھے، مقتدائے زمان و شیخ وقت اور امامِ اہلِ تصوف تھے اصناف علم میں کامل تھے۔ آپ کی وفات ۳ رمضان ۲۵۳ھ میں ہوئی۔ قبر شونیز (بغداد) میں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اگر مجھے کہے کہ مر جا تو یہ حکم مان کر مر جاتا ہوں اور موت کے داعی سے کہتا ہوں خوش آمدید!

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ محب محبوب کے تمام اوامر و نواہی کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے کسی حکم یا خواہش کی مخالفت نہیں کرتا۔ رابعہ بصری کی طرف یہ دو شعر منسوب کیے جاتے ہیں:

تعصی الالٰہ وانت تظہر حبّہ ۔۔۔ ھذا لعمری فی الفعال بدیع

ان کان حبک صادقا لاطعتہ ۔۔۔ ان المُحب لمن یحب مطیع

یعنی "تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس سے اظہار محبت بھی کرتا ہے۔ میری جان کی قسم یہ عجیب کام ہے، اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محب محبوب کا مطیع ہوتا ہے" اور ہر حال میں مطیع ہوتا ہے۔ خواہ محبوب اس پر جفا کرے یا اس سے وفا کرے،

اسی خیال سے خواجہ یحییٰ معاذؒ نے محبت کی حقیقت یہ بتلائی ہے:

حقیقۃ المحبۃ مالا ینقص بالجفاء وما لا تزید بالبر والعطاء۔ ۔۔۔ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جفائے محبوب کی وجہ سے کم نہیں ہو جاتی اور نہ اس کی نیکی و عطا کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔

کمالِ محبت میں وفا جفا کے برابر اور جفا وفا کے مانند ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی کاملِ محبت کا قول ہے:

اگر قصدِ جفا دارد سر و رویش اندازم
وگر راہ وفا گیرد جاں در قدمش ریزم

کہا جاتا ہے کہ حضرت شبلیؒ کو مجنون سمجھ کر قید کر دیا گیا، ان کے چند دوست انہیں دیکھنے قید خانہ پہنچے۔ شبلیؒ نے پوچھا: "من انتم؟" تم کون ہو؟ انھوں نے جواب دیا: "احباءُک" ہم آپ کے دوست ہیں۔ شبلی نے ان پر پتھر برسانا شروع کیا اور وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ شبلی نے کہا:

لو کنتم احبائی ما فررتم من بلائی۔ — اگر تم میرے دوست ہوتے تو میری آزمائش سے بھاگ نہ جاتے۔

سچ ہے: "بلا از دوست عطا است و از عطا نالیدن خطا ست"۔ محب صادق کے لیے بلائے محبت ایک نعمت ہے اور نعمت سے بھاگنا خلافِ عقل ہی ہے۔ یہی مطلب سعدیؒ کا بھی ہے:

قادری بر ہر چہ می خواہی بجز آزار من
زانکہ گر شمشیر بر فرقم نہی آزار نیست

محبت کے اس جذبہ کو سعدیؒ نے ایک قطعہ میں خوب ادا کیا ہے:

بسیار رود دل آمد از اندیشہا و رفت — نقشے کہ آں نمی رود از دل نشانِ توست
با من ہزار نوبت اگر دشمنی کنی — اے دوست ہمچناں دلِ من مہربانِ توست

اور اسی جذبۂ محبت سے مست ہو کر وصال شیرازی چیخ اٹھا تھا:

تو از جفا و ستم بر من انچہ خواہی کن
بکن کہ من نہ کنم دامنت رہا اے دوست

محبت کی ان ساری تعریفات کا دارومدار محبت کے آثار و ثمرات پر ہے، ہر شخص کی نظر میں بعض آثار زیادہ قوی معلوم ہوئے ان ہی کے تعلق سے اس نے محبت کی ایک تعریف کر دی، محبت کی حقیقت کا ان سے انکشاف نہیں ہوتا یہ تو محبت کے محض ثمرات و نتائج ہیں، محبت کی حقیقت تو جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے، محبوب یا مرغوب و موافق شے کی طرف قلب کا میل یا انجذاب ہے اور بس۔

محبت کی حقیقت ہی کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہم نے ان اوپر کے صفحات میں محبت کے مراتب و درجات اس کے آثار و ثمرات کا ذکر کیا ہے، اب ہم محبت کے شواہد و علامات کے ذکر پر اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

علاماتِ محبّت

محبت کی علامتیں بیشمار ہیں، مگران کا مشاہدہ دیدۂ محبت ہی سے ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں ان چند علامتوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ محب صادق کی تمیز مدعی محبت سے ہو جائے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: المحبۃ شجرۃٌ طیبۃٌ اَصلُھا ثابتٌ وَّ فَرعُھَا فِی السَّمَآءِ وثمارھا تظہر فی القلب واللسان والجوارح۔[1]

(۱) جس شخص کو حق تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اس کے دل میں دنیا و آخرت کی محبت نہیں رہتی۔ حق سبحانہ و تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کی:

یا عیسیٰ انی اذا اطلعتُ علیٰ	اے عیسیٰ جب میں بندہ کے قلب سے واقف ہوتا ہوں
قلب عبد فلم اجد فیہ حب	اور اس میں دنیا و آخرت کی محبت کو نہیں پاتا ہوں تو اس
الدنیا والآخرۃ ملأتہ حبی	کو اپنی محبت سے بھر دیتا ہوں۔

اور داؤد علیہ السلام کے اخبار میں آیا ہے:

یا داؤد انی حرمتُ علی القلوب	اے داؤد میں نے دلوں پر اس چیز کو حرام کر دیا ہے کہ
ان ید خلھا حبی وحبّ غیری	ان میں میری محبت اور میرے غیر کی محبت داخل ہو۔

کسی شیدائی کا قول ہے:

بہ درویش تا نظر کردم، دل از کونین بر کندم
بریدم از ہمہ عالم، چو شد با دوست پیوندم

سعدی نے بھی اس جذبہ کو خوب ادا کیا ہے:

گر دنیا و عاقبت بیارند — کیں ہر دو بگیر و دوست بگزار

---

[1] محبت ایک پاک درخت ہے اس کی جڑیں مضبوط ہیں اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچ گئی ہیں اور اس کے پھل قلب زبان اور اعضا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ما یوسفِ خود نمی فروشیم تو سیم سپید خود نگہدار

یہ ہو سکتا ہے کہ محبتِ الٰہی شفقت بر خلق کے ساتھ ایک دل میں جمع ہو، اور بعض کو یہ محبت نظر آئے اس کے شفقت ہونے کی علامت یہ ہے کہ جس قلب میں یہ دونوں جمع ہیں اگر اس کو اس امر کا اختیار دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرلے تو وہ قطعاً محبتِ الٰہی کو اختیار کرے گا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ امام حسین بن علی علیہما السلام نے ایک دفعہ اپنے والد بزرگوار سے پوچھا: "کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" حضرت علیؓ نے فرمایا: "ہاں" حسین نے پوچھا: "کیا آپ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں؟ کہا: "ہاں" حسین نے کہا "ھیھات لایجتمع محبتان فی قلب واحد!" حضرت علی آبدیدہ ہوئے۔ حسین نے فوراً کہا: "یا ابت ماتقول لو انک خیرت بین قتلی وترک الایمان؟" یعنی آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر آپ کو میرے قتل کیے جانے اور ایمان کے ترک کرنے میں اختیار دیا جائے تو آپ کس کو پسند کریں گے؟ حضرت علی نے فرمایا: "اخترت القتل علی ترک الایمان" میں قتل کو ترکِ ایمان پر ترجیح دوں گا۔ اس وقت حسین نے کہا: "ابشر یا ابت فان تلک محبۃ وھذہ شفقۃ" میں آپ کو بشارت دیتا ہوں اے والد بزرگوار، وہ محبت ہے اور یہ شفقت! یعنی جو رابطہ آپ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے وہ "محبت" ہے اور جو رابطہ آپ کو ہم سے ہے وہ "شفقت" ہے۔ حضرت علیؓ نے ان کی پیشانی کا بوسہ لیا اور فرمایا: "یہ بات جو تم نے کہی وہ فاطمہؓ کے شکم سے نکلی ہے نہ کہ علی کی پشت سے اور فاطمہ کے متعلق آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا: الفاطمۃ بضعۃ منی" یعنی فاطمہ میرے گوشت کا ایک ٹکڑا ہے"[1]۔

یہ نکتہ یوں بھی سمجھایا گیا ہے، جب کسی شے کی محبت قوی ہو جاتی ہے تو محبوب

[1] تبصرۃ الاصطلاحات الصوفیہ از سید اکبر حسینی ص ۲۸، مطبوعہ معین پریس، حیدر آباد، ۱۳۶۵ھ۔

سے تجاوز کر کے ہر اس چیز سے بھی ہو جاتی ہے جو محیط بالمحبوب ہے۔ چنانچہ عرب میں مثل مشہور ہے: من یحب انسانا یحب کلب محلته، یعنی جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے وہ اس کے محلہ کے کتّے سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اسی اصول کی تفہیم مولانائے روم مجنون کے قصے سے کرتے ہیں: کسی نے مجنون کو دیکھا کہ وہ ایک کتّے سے لاڈ پیار کر رہا ہے، اس نے کہا: اے مجنون، کتا غلیظ جانور ہوتا ہے، پلیدی کھاتا ہے، اپنی مقعد کو اپنے ہونٹوں سے چاٹتا ہے، تو کیوں اس سے کھیل رہا ہے؟ مجنون نے یہ سن کر جواب دیا:

گفت مجنوں تو ہمہ نقشی و تن　　اندر آ بنگر بشے از چشم من

کیں طلسم بستۂ مولاست ایں　　پاسبانِ کوچۂ لیلےٰ است ایں

یہ عمل "شرکت فی الحب" نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ جب عاشق اپنے معشوق کے قاصد و نامہ بر اور اس کے خط کو دوست رکھتا ہے کہ یہ اس کے معشوق کا نامہ ہے تو اس کی محبت غیر محبوب سے نہیں ہوتی، محبوب ہی سے ہوتی ہے بلکہ یہ کمال محبت کی دلیل ہوتی ہے۔ جس کسی کے دل پر اللہ تعالےٰ کی محبت غالب ہو جاتی ہے، تو وہ ساری خلق اللہ سے شفقت سے پیش آتا ہے اس لیے کہ وہ اس کے محبوب کی مخلوق ہے! اس نکتہ کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے:

در یاد روئے تست کہ مستم ببوئے گل
با گل مرا چہ، دوستیش ہم ببوئے تست!

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ اس کی نظر حسنِ محبوب سے نہیں ہٹتی خواہ کیسا ہی حسین اس کی نظر سے گذرے:

بجمعے کہ در آیند شاہدان دو عالم　　نظر بسوئے تو دارم غلام روئے تو باشم

حدیثِ روضہ نگویم، گلِ بہشت نبویم　　　جمالِ حور نجویم، دواں بکوئے تو باشم

(سعدی شیرازی)

اور حافظ شیرازی نے ببانگ دہل کہا تھا:

من آں نیم کہ دہم نقد دل بہر شوخے

درِ خزانہ بمہر تو و نشانہ تُست

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ محب حصول وصل محبوب کے وسائل کو بھی پسند کرتا ہے اور مطیع و فرماں بردار ہوتا ہے کیونکہ یہ محبت و طاعت محبوب ہی کی محبت و طاعت ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (پ ۳ ع ۱۲)　　اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

اور زیادہ واضح الفاظ میں ارشاد ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (پ ۵ ع ۸)　　جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی۔

اسی کے پیش نظر سہل نے کہا تھا: علامت حبّ خدا کی حبّ قرآن ہے، علامت حبّ خدا و قرآن کی حب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ علامت حب نبی کی حبّ سنت ہے، علامت حبّ سنت کی، حبّ آخرت ہے اور علامت حب آخرت کی بغضِ دنیا ہے، اور علامت بغض دنیا کی یہ ہے کہ دنیا سے بقدر زاد ہی لے" (محبت کی پہلی علامت کے سلسلہ میں جو وضاحت اوپر کی گئی ہے وہ موجودہ علامت سے بھی متعلق ہے، ایک نظر اس پر ڈال لی جا سکتی ہے)

(۴) چوتھی علامت یہ ہے کہ محب وصولِ محبوب سے مانع جو چیز بھی ہو اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم کی زندگی کا ایک واقعہ ہے ہمیں اس کی

ایک عجیب مثال ملتی ہے۔ سفر حج میں آپ نے اپنے ایک ساتھی کو راضی کر لیا کہ اگر ہم دونوں میں سے کسی سے بھی کوئی منکر سرزد ہو تو اس کو دیکھ کر ہم خاموش نہ رہیں بلکہ تنبیہہ کریں۔ جب یہ مکہ پہنچے تو سواری پر ایک نہایت حسین وجمیل لڑکا نظر آیا، ابراہیم نے اس کو دیکھا، اور پھر دوسری نظر ڈالی، ان کے دوست نے فوراً تنبیہہ کی: "اے ابراہیم کیا ہم نے آپس میں عہد نہیں کیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے منکر کو پوشیدہ نہیں رکھیں گے؟" ابراہیم نے کہا: "یہ میرا لڑکا ہے، اس کی کم سنی میں میں اس سے جدا ہو گیا تھا، اب اس کو دیکھ کر میں نے پہچان لیا ہے" دوست نے کہا: "اس کو کیوں نہیں کہتے کہ تم اس کے باپ ہو؟" ابراہیم نے جواب دیا:

لا فان ذالک شئی ترکناہ للہ فلا نعود فیہ۔	نہیں یہ وہ شے ہے جس کو ہم نے اللہ کے لیے چھوڑ دیا ہے، ہم اس کو واپس نہ لیں گے۔

اور یہ اشعار پڑھے:

هجرت الخلق وطرا فی هواک — واهتمت العیال لکی اراکا

ولو قطعت اربا بشئم اربا — لما حسن الفؤاد الی سواکا[1]

(۵) پانچویں علامت یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کے ذکر پر فریفتہ ہوتا ہے، اور اس کا حریص ہوتا ہے اور کبھی اس سے ملول نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

من احب شیئاً اکثر ذکرہ — جو شخص کسی شے سے محبت کرتا ہے اس کا ذکر زیادہ کرتا ہے۔

ہر وقت وہ اپنے محبوب کی یاد میں رہتا ہے، جب بھی وہ کسی سے اس کا ذکر سنتا ہے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اگر اس سلسلہ میں اس پر ملامت بھی کی جاتی ہے تو

[1] میں نے تیری محبت کی حاجت کی وجہ سے خلق کو چھوڑ رکھا ہے، اور تیرے دیدار کے لیے عیال واطفال کا غم اٹھایا ہے۔ اگر میرا عضو عضو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے بھی تو میرا دل تیرے سوا کسی کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔

بھی وہ خوش ہوتا ہے اور اس ملامت میں اس کو لذت ملتی ہے:

اجد الملامة فی هواك لذيذة ً حبا لذكرك فليلمنی اللوّم[1]

ملامت کے بارے میں سعدی شیرازی نے خوب کہا تھا:

ملامت کے کند سر گرمیٔ شوریدگاں ساکن
نگردد سنگِ طفلاں صندلِ دردِ سرِ عاشق

(۶) محبت کی چھٹی علامت یہ ہے کہ محب محبوب کے تمام اوامر و نواہی کی اطاعت کرتا ہے اور کبھی اس کی مخالفت کا قصد نہیں کرتا، محبت نام ہی اس کا ہے کہ محبوب کے ساتھ جمیع احوال میں موافقت کی جائے، وہ جیسا کہ سہل تستری نے کہا: معانقة الطاعة و مباينة المخالفة کا نام ہے۔ اس سلسلہ میں سعدی نے عاشق کا نقشہ خوب پیش کیا ہے:

درآں نفس کہ بمیرم درآرزوئے تو باشم بداں امید بدہم جاں کہ خاک کوئے تو باشم
بوقتِ صبحِ قیامت کہ سر زخاک برآرم بگفتگوئے تو خیزم بجستجوئے تو باشم

عاشق صادق محبوب کے حکم کے خلاف کیسے کر سکتا ہے؟ ان المحب لمن يحب مطيع (رابعہ عدویہ)

(۷) محبت کی ساتویں علامت یہ ہے کہ محبوب کی تھوڑی سی بھی عنایت کو بہت زیادہ جانتا ہے اور اپنی بڑی سے بڑی اطاعت کو کم سمجھتا ہے۔

گرچہ اندک بود انعام تو باشد بسیار
ورچہ بسیار کنم شکرِ تو باشد اندک

(۸) محبت کی آٹھویں علامت مشاہدۂ جمال محبوب میں عاشق کی حیرت و سرگشتگی

[1] تیری محبت میں میں ملامت کو بھی لذیذ پاتا ہوں، اس لیے کہ میں تیری یاد کو دوست رکھتا ہوں، پس ضرور مجھ پر ملامت کی جائے۔

ہے۔ مشاہدۂ محبوب کے نور کے پرتو سے عاشق کی نظرِ بصیرت کند اور درماندہ ہوجاتی ہے اور اس سے تحیر و حیرانیاں و خجالات پیدا ہوتی ہے اگر صاحب حال مقامِ تمکین میں قائم ہوتا ہے اور اپنے احوال پر قابو رکھنے کی قوت رکھتا ہے۔ تو یہ حیرت حیّزِ روح سے تجاوز نہیں کرتی اور قلب ترتیب افعال و اقوال کی محافظت سے غافل نہیں ہونے پاتا؛ بلکہ جس قدر اس کی روح مشاہدۂ محبوب میں حیران ہوتی ہے۔ اسی قدر اس کا قلب حاضر و ہوشیار ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رب زدنی تحیراً فیک کا نعرہ لگاتا ہے، لیکن اگر اس کی قوتِ تمکین زیادہ نہ ہو اور اس حال کے غلبہ کی وجہ سے سررشتۂ تمیز اس کے اختیار سے نکل جائے تو پھر وہ چیخ اٹھتا ہے:

قد تحیرتُ فیك خذ بیدی — یا دلیلاً لمن تحیر فیك[۱]

(۹) محبت کی نویں علامت یہ ہے کہ محبوب کا مشاہدہ اور وصال عاشق کے شوق میں کمی نہیں پیدا کرتا، بلکہ ہر لحظہ اس کا شوق تازہ ہوتا جاتا ہے اور وہ ھل من مزید کا نعرہ لگاتا ہے اور اس کے مراتب قرب میں جتنی زیادتی ہوتی جاتی ہے، اس کی نظر اس سے بلند مرتبہ پر پڑتی ہے اور اس کی طلب کا شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جس طرح جمالِ محبوب کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ عاشق کے شوق کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رأیت فی ارض البادیہ امرأۃ	میں نے کسی جنگل میں ایک عورت کو دیکھا
تسر مع المحبۃ، فسألتها	کہ وہ محبت کی وجہ سے مسرور تھی میں نے
عن غایۃ المحبۃ فقالت لی	اس سے انتہائے محبت کے متعلق سوال کیا

۱؎ تیرے بارے میں متحیر ہو گیا ہوں، اے متحیرین کے رہنما مجھے سنبھال!

لها غاية فقلت ولِمَ؟ فقالت لان المحبوب لا غاية له۔

اس نے کہا کہ محبت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، میں نے کہا: کیوں؟ کہا کہ محبوب کی کوئی انتہا نہیں!

ہم نے اوپر محبت کی صرف چند علامتوں کا ذکر کیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ ان کا حصر ضخیم مجلدات میں بھی ممکن نہیں لیکن بمضمون مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ ہم نے یہاں صرف چند مشہور علامات کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

باب (۲)

اسبابِ مَحبّت

محبت اور عشق کی نفسیانی حقیقت و ماہیت کے سمجھ لینے کے بعد اب ہم ان کے پیدا ہونے کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس موضوع پر حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد غزالیؒ نے سیر حاصل بحث کی ہے اور ہماری توجہ چند اساسی نفسیانی حقایق کی طرف مبذول کی ہے۔ ہم اُن کی مُخلّد الذکر تصنیف "احیاء علوم الدین" سے استفادہ کرتے ہیں اور نہایت اختصار کے ساتھ ان حقایق کو پیش کرتے ہیں۔[1]

امام نے پہلے تو اس ناقابل انکار حقیقت پر زور دیا ہے کہ محبت کے واسطے معرفت یعنی پہچان یا علم و ادراک کی ضرورت ہے۔ اگر پہچان نہ ہوگی تو محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ جس چیز کے ادراک سے کسی قسم کی لذّت حاصل ہو وہ چیز دل کو محبوب ہوگی اور جس چیز سے ایذا پہنچے وہ دل کو مبغوض ہوگی، اس لیے محبوب کے معنے یہ ہیں کہ طبیعت

---

[1] دیکھو کتاب المحبۃ والشوق (وہو الکتاب السادس من ربع المنجیات من کتاب احیاء علوم الدین) مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۲۹۰ھ م دسمبر ۱۸۷۳ء ص ۱۵۸ تا ص ۱۹۶ اس کا ترجمہ اُردو میں مذاق العارفین کے نام سے ہوا ہے، مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی نے کیا ہے۔ جلد چہارم ص ۳۳۳ تا ص ۴۱۱ ترجمہ بھی نول کشور پریس سے چھپا ہے۔ بار پنجم ۱۹۱۳ء م ۱۳۳۱ھ

کو اس کی طرف میل ہو اور مبغوض کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت کو اس سے نفرت ہو۔ اب اگر طبیعت کی رغبت زیادہ بڑھ جائے تو اس کو عشق کہیں گے اور اگر نفرت بڑھ جائے تو اسکو "مقت" یا عداوت کہیں گے۔

اس حقیقت کے اظہار کے بعد امام نے محبت کے اسباب و اقسام پر روشنی ڈالی ہے، محبت کے اسباب پانچ ہیں اور اس کے پانچ ہی اقسام ہیں:

(۱) محبتِ نفس یعنی اس کی بقا و کمال کی محبت۔

(۲) محبتِ حُسن۔

(۳) محبتِ صاحبِ کمال۔

(۴) محبتِ جمیل۔

(۵) محبتِ حاصلہ از تعارفِ روحانی۔

دوسرے الفاظ میں ہر شخص کو فطری طور پر اپنی ذات اور اس کے دوام و بقا سے محبت ہوتی ہے۔ احسان بھی محبت کو پیدا کرتا ہے، کمال ہر قسم کے جذباتِ محبت کو بیدار کرتا ہے اور حسن و جمال محبت کے شعلہ کو بھڑکاتے ہیں اور افراد میں مناسبت باطنی یا ان کی ارواح میں تناسب بھی محبت کا باعث ہوتا ہے۔ اب اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔

(۱) محبتِ نفس:

یہ ایک ناقابلِ انکار ضروری وجدانی حقیقت ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے، وہ اپنی ذات کو چاہتا ہے اور اس کے دوام و کمال و بقا کو چاہتا ہے اور موت، ہلیتی و نقصان اور موانع کمال کو ناپسند کرتا ہے، اور ان سے بغض رکھتا ہے۔ یہ چیز انسان کی سرشت یا فطرت میں داخل ہے، وہ اسی پر مجبول ہوا ہے۔ اس لیے انسان اول تو اپنی صحت چاہتا ہے، پھر اپنے مال و اولاد اور دوست

آشناؤں کی بقا چاہتا ہے، کیونکہ وہ ان کی بقا کو اپنی ذات ہی کی بقا سمجھتا ہے۔ جانتا ہے کہ ان سے ان کا نام باقی رہے گا اور جس قدر اس کا مال و دولت، کنبہ و قبیلہ زیادہ ہو گا، اس کی عزت و شوکت میں ترقی ہو گی۔ صاف ظاہر ہے کہ ان سب سے محبت دراصل اس کی اپنی ذات کی محبت پر مبنی ہوتی ہے۔

انسان کی یہ ایغویت پسندی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور امام غزالی اس کو ایک نفسیاتی صداقت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ آگے چل کر وہ بتلاتے ہیں کہ علم صحیح انسان کو اپنی ذات کی محبت سے نکال کر اپنی ذات کے خالق و موجد کی محبت کی طرف لے جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ذات کو قیام ہے۔

(۲) احسان:

انسان کی فطرت پر نظر اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ انسان میں جاذبۂ محبت کا ایک نہایت قوی محرک "احسان" ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ احسان کا سلوک کرتا ہے یعنی اس کو مال و دولت عطا کرتا ہے، اس کی حاجتوں کو پوری کرتا ہے، اس کی مدد و اعانت کرتا ہے، اس کا معین و مددگار رہتا ہے۔ اس کو دشمنوں کے شر سے بچاتا ہے اور اس کے مقاصد کے حصول میں اسباب فراہم کرتا ہے، اس کی خواہشات کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کے عزیز و اقارب کو خوش و خرم رکھتا ہے، لہٰذا ایسا شخص ضرور اس کی نظر میں محبوب ہو جائے گا اور وہ ایسے محسن کو جان و دل سے محبت کرنے لگے گا یہ انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے، اسی لیے سعدی نے کہا تھا:

کرم پیشہ کن کآدمی زادہ صید
باحسان تواں کرد وحشی بقید

یعنی آدمی احسان کا بندہ ہوتا ہے، وحشی سے وحشی بھی احسان کی زنجیر دل میں

جکڑا جاتا ہے، ان سے نکلنا اس کے لیے فطرۃً محال ہے، عربی میں یہ مشہور مثل ہے؛
"الاِنسانُ عَبیدُ الاِحسانِ" انسان بندۂ احسان ہوتا ہے،

(۳) کمال

کمال سے محبت بھی فطرتِ انسانیہ کا ایک ناقابل انکار خاصّہ ہے، جو شخص اوصاف کمالیہ علم، سخا، و تقویٰ وغیرہ سے موصوف ہوتا ہے، اس کی یہ صفتِ کمال ہر انسان کے دل میں اس کی محبت پیدا کرتی ہے گو اس سے کسی خاص آدمی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے، مثلاً اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ فلاں حاکم بڑا عادل، غریب پرور اور رعیت نواز پرہیزگار، عابد، سخی و کریم، حلیم و متواضع ہے، گو وہ کسی ایسے دور کے مقام میں ہو جہاں سننے والا کبھی پہنچ نہ سکے، تب بھی اس کی محبت بے اختیار اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی۔ طبیعتِ انسانی مجبول ہے کہ کمال سے محبت کرے اور ذی کمال کی محبت میں گرویدہ ہو جائے۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ محبت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ محب پر کوئی خاص احسان ہوا ہو، اور محض اس احسان ہی کی وجہ سے وہ محسن سے محبت کرنے لگے، بلکہ یہ حقیقت بھی اسی قدر ناقابلِ انکار ہے کہ محسن محض اپنی ذات و اوصافِ کمالیہ کی وجہ سے بھی محبوب ہوتا ہے، گو اس کا احسان محب تک کبھی نہ پہنچے، کیونکہ کمال سے محبت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔

(۴) حسن وجمال:

محبت کا چوتھا سبب حسن وجمال ہے۔ حسن وعشق نے ازل ہی سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ جہاں حسن ہوتا ہے وہاں محبت وعشق کا ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ کسی عارف نے کہا ہے:

آں را کو چنیں جمال باشد   گر دل می برد حلال باشد

وآنکس کو چنیں جمال بیند　　عاشق نہ شود وبال باشد

حسن وجمال سے محبت ایک طبعی وفطری چیز ہے، حسن وجمال طبعاً محبوب و مرغوب ہیں۔ امام غزالیؒ اس حقیقت کو بھی واشگاف کرتے ہیں کہ حسن سے بلاشہوت بھی محبت ہو سکتی ہے، اس کی مثال سبزہ وآبِ رواں سے محبت ہے، اس کے دیکھنے ہی سے آپ کو ایک لذت وراحت ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر حق تعالیٰ کا جمالِ بے مثال انسان کو معلوم ہو جائے تو ممکن ہے کہ وہ اس پر ہزار جان سے گرویدہ ہو جائے، مولانائے روم نے اسی کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا:

اصلِ صد یوسف جمالِ ذوالجلال!
اے کم از زن، شو فدائے آں جمال

امام غزالیؒ کی تحقیق کی رو سے حسن وجمال[1] کو نہ صرف ظاہری حسن وجمال ہی میں منحصر تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ عشق ومحبت کو صرف "مساسِ چشم با چشم" پر یعنی عشق نہ محض "بازیچۂ شہوت وجوانی"[2] ہو سکتا ہے اور نہ حسن صرف صورت و رنگ ہی کا نام ہے۔ جو شخص بہائم کے مرتبہ کے قریب ہو اور فقط بصارت رکھتا ہو اور بصیرت سے اس کو کچھ حصہ نہ ملا ہو وہ ضرور کہے گا کہ رخسار کی سرخی وسفیدی اور تناسبِ اعضا کے سوا حسن کے کچھ اور معنی نہیں، حُسن صورت و رنگ ہی پر مشتمل ہوتا ہے اور جو صورت و رنگ نہ رکھتا ہو اس میں حسن کا ہونا محال ہے،

---

[1] بعض کے خیال میں "حسن" چہرے کی خوبصورتی کو کہتے ہیں اور "جمال" اعضاء کے سڈول پن کو، اور "ملاحت" دونوں کو شامل ہے۔

[2] یہ الفاظ خواجہ نظامی کے ہیں؛ فرماتے ہیں:

عشقیکہ نہ عشقِ جاودانی است　　بازیچۂ شہوت وجوانی است
آں عشق کہ سرسری خیال است　　آنرا ابداً لاَبد زوال است

لیکن ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس گذشتہ شہودیت کا یہ خیال صحیح نہیں۔ دیکھو تمام عقلمند کہتے ہیں کہ یہ خط حسین یا خوشنما ہے، یہ آواز خوب ہے، یہ کپڑا دلکش ہے، یہ گھوڑا خوب صورت ہے، یہ باغ خوبصورت ہے، یہ شعر دلکش ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہر چیز کے حسن و جمال کے معنی یہ ہیں کہ جو کمال اس چیز کے لایق اور ممکن ہو وہ اس میں پایا جائے، جب تمام کمالات ممکنہ کسی شے میں جمع ہو جائیں تو وہ شے حسن کے لحاظ سے بھی کامل ہوگی، اور اگر بعض کمالات موجود ہوں اور بعض نہ ہوں تو حسن و جمال بھی اسی حد تک ہوگا۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ یہ گھوڑا حسین یا خوبصورت ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جتنی باتیں خوبی کی گھوڑے میں ہونی چاہئیں وہ سب موجود ہیں یعنی صورت شکل، رنگ ڈھنگ، خوش رفتاری، خوش لگامی وغیرہ سب اس میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح خط کو حسین اس وقت کہا جائے گا جب اس میں خوش نویسی سے متعلق امور موجود ہوں یعنی حروف کا تناسب، نشست کی راستی، کرسی کا درست ہونا، دائرہ کی خوبی وغیرہ۔ اور ہر شے کا کمال جدا جدا ہوتا ہے، اسی لیے جن کمالات کی موجودگی کی وجہ سے گھوڑے کو اچھا کہتے ہیں ان سے کسی شخص کو اچھا یا حسین نہ کہیں گے، اسی طرح جن امور کی وجہ سے خط حسین کہلاتا ہے ان سے گھوڑے کو حسین نہ کہیں گے۔ اسی طرح دوسری چیزوں کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حسن و جمال اس کمال کا نام ہے جو کسی شے کے شایان ہوتا ہے۔ اس موقع پر ایک اعتراض ذہن میں پیدا ہوتا ہے؛ مانا کہ ساری چیزوں کا ادراک صرف آنکھ سے نہیں ہوتا، مثلاً آواز اور ذائقہ مگر ان کا ادراک کسی نہ کسی حس سے تو ضرور ہوتا ہے، لہٰذا وہ محسوسات ہی میں داخل ہو جاتی ہیں، پھر ان اشیاء کا حسن و جمال کیسے تصور کیا جا سکتا ہے جو حواس سے مدرک نہ ہوں؟ جو چیز مدرک بالحواس

نہ ہو وہ حسن وجمال کی حامل کیسے ہوگی ؟

ہم کہتے ہیں کہ غور وفکر سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ حسن وجمال محسوسات ہی پر منحصر نہیں، غیر محسوس میں بھی حسن وجمال مانا جاتا ہے۔ سب ہی کہتے ہیں کہ فلاں شخص میں حسنِ خُلق پایا جاتا ہے، اخلاقِ جمیلہ کا اعتراف ہر شخص کرتا چلا آیا ہے، اور اخلاقِ جمیلہ سے مراد علم وعقل وحکمت عفت وشجاعت، صداقت، کرم، تقویٰ، مروّت سب مکارمِ اخلاق ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی حواسِ خمسہ سے ادراک نہیں ہوتا، بلکہ ان کا علم بصیرتِ باطنی سے ہوتا ہے اور یہ سب کے سب محبوب ہیں اور جو شخص ان سے متصف ہوتا ہے وہ بھی طبعاً محبوب ہوتا ہے، انسان کی فطرت میں ان سے محبت ودیعت ہوتی ہے۔ تم چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ صورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں اور دونوں میں حسن وجمال ہوتا ہے، ایک صورتِ ظاہری جو چشمِ ظاہر سے محسوس ہوتی ہے دوسری صورتِ باطنی جو چشمِ باطن سے مدرک ہوتی ہے۔ دونوں بھی بالطبع محبوب ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صالحین وابرار سے ہمیں محبت ہوتی ہے، گو ہم نے ان کو دیکھا بھی نہ ہو محض ان کا تذکرہ ہی سنا ہو، ان سے محبت صورتِ باطن کے حسن وجمال کی وجہ سے ہوتی ہے، ان کے علم، ورع وتقویٰ کی وجہ سے ہوتی ہے اور علم وتقویٰ کی کوئی ظاہری صورت تو ہوتی نہیں جو چشمِ سر سے نظر آئے۔

(۵) تعارفِ روحانی:

محبت کا پانچواں سبب وہ مناسبت ہے جو طبائع میں پائی جاتی ہے جب کسی شخص کی طبیعت دوسرے شخص کے مناسب وموافق ہوتی ہے تو وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ مناسبت کبھی تو ظاہری ہوتی ہے، جیسے بچے کو بچے سے اُنس ہوتا ہے، بازاری کو بازاری سے، عالم کو عالم سے، اور ہر ایک کو اپنے ہم جنس سے

محبت ہوتی ہے، اور کبھی یہ مناسبت پوشیدہ ہوتی ہے اور اصل خلقت میں پائی جاتی ہے، کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا، شاید اسی کی طرف پیغمبر اسلام صلوٰۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا ہے:

الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منھا ایتلف وما تناکر منھا اختلف۔

روحوں کے بھی (ابتدائی خلقت میں) جھنڈ جھنڈ تھے پھر جو روحیں آپس میں اس وقت آشنا ہوئیں (دنیا میں آکر) وہ باہم الفت کرنے لگیں اور جو نا آشنا رہیں وہ دنیا میں بھی (آکر) الگ الگ رہیں۔

محبت وعشق کے یہی پانچ اسباب سمجھ میں آتے ہیں، ان ہی کی وجہ سے محبت پیدا ہوتی ہے، ان کی توضیح وتفصیل کے بعد امام غزالی تمام اہل اللہ کی طرف سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان تمام اسباب کی بنا پر،

"مستحق محبت فقط ایک ذات پاک حق تعالیٰ کی ہے"

اور کوئی دوسرا مستحقِ محبت فی ذاتہ نہیں، انبیاء کرام واولیائے عظام سے محبت بھی بذاتہ نہیں بلکہ ان سے بھی محبت اللہ جل شانہ کی محبت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، کیونکہ محبوب کا محبوب محبوب ہوتا ہے، محبوب کا رسول وپیغامبر بھی محبوب ہوتا ہے، محبوب کا محب بھی محبوب ہوتا ہے، ان سب کی محبت عین محبت الٰہی ہے:

عشق را با تو نسبتے است درست
بر ہر در کہ رفت بر درِ تست

اس کی تشریح کے لیے ہم محبت کے مذکورہ بالا پانچ اسباب کی طرف پھر رجوع کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب کے سب حق تعالیٰ ہی میں جمع ہیں اور غیر اللہ میں سے کسی میں ایک ساتھ نہیں پائے جاتے، اور حق تعالیٰ ہی میں یہ حقیقۃً

پائے جاتے ہیں اور غیر اللہ میں محض مجازاً ، بلکہ یہاں ان کا وہم و تخیل ہی ہوتا ہے، ان کی کچھ حقیقت ہی نہیں ہوتی ۔ لہٰذا سوائے حق تعالیٰ کے کسی سے محبت نہ کی جانی چاہیے اور یہی محبت یا عشق "عشقِ حقیقی" کہلاتا ہے ۔

(۱) اب محبت کے اسباب میں سے پہلے سبب پر غور کرو:

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے فطرۃً و خلقاً محبت ہوتی ہے اور وہ اس کا دوام و بقا چاہتا ہے اور نیستی و عدم سے وہ نفرت کرتا ہے اور تمام موانعِ کمال کو وہ ناپسند کرتا ہے ۔ اب یہی سبب حق تعالیٰ سے محبت یا عشق کا سب سے بڑا سبب ہے ۔ جس شخص کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی ہستی یا وجود خود اس کی ذات سے قائم نہیں ، بلکہ اس کا وجود و دوام و کمال کسی اور ہی سے ہے ، جس نے اس کو پیدا کیا ، زندگی عطا کی ، کمال تک پہنچایا ، وہی اس کا خالق و موجد ہے ، قیوم ہے ، وہی اس میں صفاتِ کمال پیدا کرتا ہے ، ان کی تکمیل کے اسباب فراہم کرتا ہے ، ورنہ انسان بذاتِ خود عدمِ محض ہے ، لاشئی ہے جیسے قرآنِ حکیم نے بھی واضح طور پر بیان کیا ہے :

قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (پ ۱۶ ع ۴) میں نے تم کو پیدا کیا حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے ۔

جب کسی ذی فہم انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا وجود اس حی و قیوم کی وجہ سے ہے جو قائم بالذات ہے اور تمام اشیاء کا قیوم ہے ۔ تو پھر وہ ضرور اس ہستی کی محبت اپنے سویدائے قلب میں محسوس کرنے لگتا ہے جو اس کے وجود کا خالق ہر آن اس کا قائم رکھنے والا ہے ، منعم و محسن ہے ۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دھوپ سے بچنے کی خاطر درخت کے سایہ کی پناہ لے اور سایہ کو دوست رکھے اور درخت کو ناپسند کرے جس کی وجہ سایہ کا قیام ہے ؟ اسی طرح اس کو معلوم ہے کہ اس کا وجود اور اس کی ساری صفات کا قیام حق تعالیٰ ہی کا رہینِ احسان ہے ، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے

کہ وہ حق تعالیٰ کی محبت شدت کے ساتھ اپنے قلب میں محسوس نہ کرے؟ یہ اور بات ہے کہ یہ شخص جاہل ہو، نہ اپنی ذات کو جانتا ہو اور نہ اپنے رب کا اس کو عرفان حاصل ہو، کیونکہ یہ اصول مسلمہ ہے کہ کسی شے سے محبت اس کی معرفت کا ثمرہ ہوتی ہے اور جاہل کو معرفت نہیں ہوتی اس لیے اس کو محبت ہی نہیں ہو سکتی، وہ حق تعالیٰ کی محبت سے محروم رہتا ہے، ہمیں اس کی بدنصیبی پر افسوس ہوتا ہے! عارف کی نصیحت تو ہمیشہ یہ رہی ہے ؎

رو دل بکسے دہ کہ در اطوار وجود

بودہ است ہمیشہ یا تو خواہد بود

(۲) محبت کا دوسرا موجب احسان ہوتا ہے۔ آدمی ذرا غور کرے تو واضح ہو جاتا ہے کہ محسنِ حقیقی تو حق تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔ احسان کسی انسان کی طرف سے غیر ممکن ہے، اگر ہم کسی کو محسن کہتے ہیں تو صرف مجازی معنی ہی میں کہہ سکتے ہیں، دراصل محسن صرف حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھو کہ اگر تم کو کوئی شخص وافر دولت عطا کرتا ہے تو وہ محسن حقیقی نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ صرف محسنِ مجازی، حقیقی محسن تو حق تعالیٰ ہی ہیں، کیونکہ اس دولت کا جمع کرنا، معطی کو توفیق عطا کرنا کہ اس میں سے کچھ تم کو دے، یہ سب کام حق تعالیٰ ہی کے ہیں جنہوں نے مال و دولت، ارادہ اور توفیق کو پیدا کیا، اگر وہ مال و دولت پیدا نہ فرماتے تو خزانہ کہاں سے جمع ہوتا؟ اور اگر معطی کے دل کو تمہاری طرف راغب نہ کرتے تو وہ تم کو کیوں دیتا؟ تمہیں دینے کا ارادہ ہی کیسے کرتا؟ حق تعالیٰ ہی نے یہ لوازم پیدا کیے، اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تمہیں دینے ہی میں اس کا دینی و دنیوی نفع ہے، ان حالات میں وہ تم کو دیتا ہے اور دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسی صورت میں محسن اسی ذات کو جاننا چاہیے جس نے معطی کو تمہارے لیے مسخر و مضطر کر دیا اور وہ تمام لوازمات فراہم کر دیئے جن سے احسان کا فعل وجود میں آیا۔

اگر تمہارے ذہن میں یہ خطرہ پیدا ہو کہ مال اس شخص کے قبضہ میں ہوتا ہے، اس لیے وہی احسان کرنے والا بھی ہے تو تمہیں یہ امر بھول نہ جانا چاہیے کہ یہ شخص صرف ایک واسطہ ہے، ذریعہ ہے حق تعالیٰ کے احسان کا، یعنی حق تعالیٰ نے اس کو مال اس لیے دیا ہے کہ وہ تم تک پہنچا دے، پھر وہ دے نہ تو کیا کرے؟ اس کی مثال میزاب (پرنالے) کی سی ہے کہ وہ پانی کے بہانے میں مجبور ہے! بہرحال یہ معطی مجازی شکر و محبت کا مستحق نہیں، اور اس کی دو صاف وجوہ ہیں: اوّل تو یہ کہ حق تعالیٰ نے تمہیں دینے کے جو لوازم ہیں وہ اس پر مسلط کر دیئے ہیں، اس کے خلاف کرنے کی وہ مجال نہیں رکھتا، اس کا حال کسی بادشاہ کے خزانچی کا سا ہے کہ وہ بادشاہ کے حکم سے دیتا ہے، بادشاہ کے حکم کی تعمیل اس کے لیے ضروری ہے، اس کو تابِ مخالفت ہرگز نہیں، اگر بادشاہ اس کو خود اس کی طبیعت پر چھوڑ دے تو وہ ہرگز نہ دے، بالکل اسی طرح حق تعالیٰ اگر محسنِ مجازی کو اس کی طبیعت پر چھوڑ دیں تو وہ کبھی کسی کو ایک کوڑی نہ دے۔ حق تعالیٰ ہی اس کے دل میں وہ لوازم و بواعث پیدا کرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ دیتا ہے، پھر وہ اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا کرتے ہیں کہ تمہیں دینے ہی میں اس کا دنیوی و دینی فائدہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ تم کو دیتا ہے۔ اپنے خیال میں اس کے بدلے عمدہ چیز لے بھی لیتا ہے، تو جس طرح بائع کو محسن نہیں کہہ سکتے اسی طرح معطی کو محسن نہ کہنا چاہیے، بائع اپنی چیز اسی وقت دیتا ہے جب اس کا بدلہ خاطر خواہ حاصل کر لیتا ہے، اسی طرح معطی بھی مال کے عوض ثوابِ اخروی یا اجرِ دنیوی، تعریف و ثنا کی صورت میں، کوئی عوض ضرور حاصل کر لیتا ہے۔ عوض ضروری نہیں کہ کوئی محسوس شے ہی ہو، بلکہ لذائذ و فوائد بھی ایسے ہی عوض ہیں کہ ان کے مقابلہ میں مال کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلا کسی عوض یا فائدے کے دینا "جود" کہلاتا ہے، اس کا صدور حق تعالیٰ کے سوا کسی سے ہونا محال ہے،

حق تعالیٰ ہی حقیقی معنی میں محسن و جواد ہیں، ان کا احسان و انعام خلق کے نفع کے لیے ہے، خود حق تعالےٰ کی ذات کو اس سے کوئی فائدہ یا نفع نہیں، نہ ان کی کوئی غرض اس سے متعلق ہے، یہ ساری ظاہری و باطنی نعمتیں جو ہمیں حاصل ہیں ان ہی کی عطا کردہ ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

أَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔ (پ۲۱ ع ۱۲) — اس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری و باطنی پوری کر رکھی ہیں۔

اور اس کثرت سے کہ ان کا شمار ممکن نہیں:

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا۔ (پ ۱۳ ع ۱۷) — اور اللہ کی نعمتیں شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے۔

کجا زبِ صدف و شکرِ ابرِ نیسان است
کہ از شمار بروں قطرہائے باران ست

جب یہ صورت ہے تو غیر اللہ کے لیے جود و احسان کا لفظ استعمال کرنا محض جھوٹ ہے یا مجاز، غیر میں جود و احسان کا ہونا محال و ممتنع ہے، جیسے سیاہی و سفیدی کا ایک ہی جگہ وقتِ واحد میں جمع ہونا محال ہے۔ حق تعالیٰ ہی جود و احسان، فضل و منت میں یگانہ ہیں، غیر کو اس میں شرکت نہیں! اس لیے اگر طبیعت محسن کی محبت پر مجبول ہے تو عارف کو چاہیے کہ حق تعالےٰ کے سوا کسی سے محبت نہ کرے اس لیے کہ احسان کا کسی دوسرے سے ہونا محال ہے، صاحبِ جود و کرم، محسنِ حقیقی صرف حق تعالیٰ ہیں وہی محبت کے مستحق ہیں! کسی عاشق نے کیا خوب کہا ہے:

ہیل تو چوں دست داد ملک جہاں گو مباش — لعل تو چوں حاصل است جوہر جاں گو مباش
عاشق روئے تو نیست طالبِ دنیا و دیں — آرزوئے جاں توئی، کون و مکاں گو مباش
گردشِ گردوں اگر قطع شود گو بشو! — حاصلِ فطرت توئی، دورِ زماں گو مباش

مایۂ جہاں ہا توئی، سود و زیاں گو مباش	بے تو نیرزد جوے، ہر چہ بود در جہاں

(۳) محبت کا تیسرا سبب کمالِ ذاتی ہے، طبیعت انسانی اس پر مجبول ہے کہ جس کسی میں کمالاتِ ذاتیہ پائے جائیں اس سے محبت کرے۔ غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سبب کی بنا پر بھی صرف حق تعالےٰ ہی مستحق محبت ہیں! ان ہی کے جودِ عمیم سے سارا عالم کسبِ نور کر رہا ہے، تمام مخلوقات کو حق تعالیٰ نے اپنے فضلِ عمیم سے پیدا کیا، ان کو ان کی ضرورت کی چیزیں عطا کیں، گو ناگوں نعمتوں سے مرفہ الحال کیا ان کی زیب و زینت عیش و راحت کے سامان فراہم کیے، ان سے بڑھ کر دینے والا، حاجتوں کا رفع کرنے والا، سخی و کریم کون ہو سکتا ہے؟ جو ذاتِ پاک ایسی محسن ہو، جو حسن کی، محسن کی، احسان کی، احسان کے اسباب کی خالق و موجد ہو، اس سے محبت نہ کرنا جہالت کی بین دلیل ہے، اس کو محسن نہ جاننا ہے، اس محسنِ اعظم کو محسن نہ ماننا ہے جس کے احسان کی کوئی انتہا نہیں جس کی سخاوت کی کوئی حد نہیں، زمین و آسمان، چاند و سورج اور ستارے آب و خاک و آتش و باد سب اسی کے جود و سخا سے فیض یاب ہیں! جیسا کہ سعدیؒ باصفا نے کہا ہے:

فضل خدائے را کہ تواند شمار کرد	یا کیست آں کہ شکر یکے از ہزار کرد؟
آں صانعِ لطیف کہ بر فرشِ کائنات	چندیں ہزار صورتِ الوان بکار کرد!
ترکیبِ آسمان و طلوعِ ستارگاں	از بہر عبرت نظر ہوشیار کرد!
بحر آفرید و بر و درختان و آدمی	خورشید و ماہ و انجم و لیل و نہار کرد!
مسمار کوہسار بنطع زمیں بدوخت	تا فرشِ خاک بر سر آب استوار کرد!
اجزائے خاکِ مردہ بہ تشریفِ آفتاب	بستانِ میوہ و چمن و لالہ زار کرد!
ابر آب داد بیخ درختانِ تشنہ را	شاخِ برہنہ پیرہنِ نو بہار کرد!
توحید گوئی تو نہ بنی آدم است و بس	ہر بلبلے کہ زمزمہ بر شاخسار کرد

مسمار: لوہے کی کیل ۱۲ — نطع: چمڑے کا فرش ۱۲

ایسے کمالاتِ نامتناہیہ کی حامل ذات ہی محبت کی مستحق ہو سکتی ہے اور اسی کا عشق لذتِ بے پایاں کا مبداء ہوتا ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں:

لذتِ عشق فرو رفت مرا در رگ و پے
عشق می گویم و جاں می دہم از لذّت وے!

(۴) "حسن و جمال" محبت یا عشق کا چوتھا قوی سبب ہوتا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ حسن و جمال کی دو قسمیں ہیں: ظاہری و باطنی۔ ظاہری حسن و جمال آنکھ سے دکھلائی دیتا ہے اور باطنی جمال دل سے نظر آتا ہے۔ جمال ظاہری کو بچے اور بہائم بھی دیکھ سکتے ہیں اور جمال باطنی کو سوائے اہل دل کوئی نہیں دیکھ سکتا جس آنکھ سے جو جمال نظر آتا ہے وہ اسی کو مرغوب و محبوب ہوتا ہے اور جمال باطنی دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے اس لیے دل کو محبوب ہوتا ہے اور دل اس کا فریفتہ و گرویدہ ہوتا ہے۔ مثلاً انبیائے عظام اور اولیائے کرام سے جو محبت ہوتی ہے وہ ان کی شکل و صورتِ ظاہری کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ ان کے جمالِ باطنی کے سبب سے ہوتی ہے جس کو کمال کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ تین صفات پر منحصر معلوم ہوتا ہے: علم، قدرت، تنزہ و تقدّس۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات بدرجۂ کمال صرف حق تعالیٰ ہی کی ذات میں جمع ہیں نہ اور کسی میں، اسی لیے صرف حق تعالیٰ ہی لائقِ محبت ہیں نہ کوئی دوسرا! ان ہی کا عاشق و شیدائی چیخ اٹھتا ہے،

تَرَکْتُ الْخَلْقَ دُنْیَاھُمْ وَ دِیْنَھُمْ
شُغْلاً بِحُبِّکَ یَا دِیْنِیْ وَ دُنْیَائِیْ!

جب علم کی فضیلت پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا علم حق تعالیٰ کے

لہ میں نے خلق کے لیے ان کی دین و دنیا کو چھوڑ دیا ہے، اے محبوب، دین اور میری دنیا تیری ہی محبت کے شغل میں میں نے ایسا کیا!

علم کے مساوی قرار نہیں دیا جا سکتا، تمام اولین و آخرین کے علوم کو یکجا جمع کیا جائے تو حق تعالیٰ کے علم کے ایک ذرّہ کے برابر بھی نہیں معلوم ہوتے، جس کے علم سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں،

مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (پ۱۵ ع ۱۰) تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

زمین و آسمان کے تمام دانا یکجا جمع ہوں اور ایک چیونٹی یا مچھر کی تخلیق کی حکمت دریافت کرنا چاہیں تو اس حکمت کے عشرِ عشیر پر بھی مطلع نہ ہو سکیں کہ :

ع دو کونش یکے قطرہ در بحرِ علم

اور جو بھی علم ان کو ملا ہے وہ بھی اس کی تعلیم ہی سے ملا ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے :

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (پ۲۷ ع ۱۱) اس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو گویائی سکھلائی۔

اگر علم کا جمال و شرف ایک محبوب شے ہے، اور موصوف کے لیے باعثِ زینت و کمال ہے تو پھر حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی محبوب نہیں ہو سکتا! اسی لیے کہا گیا ہے :

همہ تن چشم شو چو نرگس　　　　تا بہ ہر دیدہ دوست دیدہ شود

اب صفتِ قدرت کو لو۔ یہ بھی ایک کمال ہے اور ہر کمال باعثِ محبت ہوتا ہے جب ہم کسی کمال کا ذکر سنتے ہیں تو ہمارے دل کو ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے اور اس صاحبِ کمال سے ہمیں محبت ہوتی ہے، مثلاً جب ہم علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت کا ذکر سنتے ہیں تو ہمارے دل کو ایک فرحت حاصل ہوتی ہے اور ان سے ہمارے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے حق تعالیٰ کے قدرت و غلبہ، جلال و عزت پر غور کرو، جس کے قبضۂ قدرت میں ساری کائنات ہے، تمام آسمان و زمین، افلاک و کواکب، سر بفلک پہاڑ، طوفان خیز سمندر، تمام معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسان ہیں۔ ان سب کا وہی خالق ہے، وہی ان پر متصرّف، سب کی باگ اسی کے یدِ قدرت میں ہے، اگر وہ سب کو تباہ کر دے تو اس کی مملکت میں ایک ذرّہ

کی کمی نہ ہو، لاکھوں کو پیدا کرے تو ذرا بھی نہ تھکے، حول و قوت اس کے سوا کسی کو نہیں، وہی جبار و قہار، دانا و توانا ہے، عظمت و جلال و کبریا، قہر و استیلا سب اسی کو شایاں ہیں! علیہ ۱۲

اب اگر کسی سے محبت کمالِ قدرت کی وجہ سے ہو سکتی ہے تو ایسی محبت کا مستحق حق تعالیٰ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

ابذلوا ارواحکم یا عاشقین ان تکونوا فی ھوانا صادقین[ا]

گوئے دولت آں سعادت مند برد کہ بپائے دلبرِ خود جاں سپرد

اب صفتِ تقدس پر غور کرو عیوب و نقائص سے مبرا اور رذائل و خبائث سے منزہ ہونا ایسی صفت ہے جس کا شمار موجباتِ محبت و مقتضیاتِ حسن و جمال میں سے ہوتا ہے۔ اسی صفت کے پائے جانے کی وجہ سے ہم انبیاء و اولیاء صالحین و ابرار سے محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ کہ انبیاء و صدیقین بھی عیوب و نقائص سے بری ہوتے ہیں مگر یہ صفت ان کو بھی بدرجۂ کمال حاصل نہیں ہوتی۔ کمالِ تقدس و تنزہ سوائے اس ذات پاک کے کسی میں موجود نہیں جس کی صفت اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ہے! کوئی مخلوق ایسی نہیں جس میں کوئی عیب یا نقص نہ پایا جاتا ہو، خود مخلوق ہونا، عاجز و مسخر و مجبور ہونا عین نقصان ہے! اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کمال جس صفت کا نام ہے وہ خدائے واحد ہی کے لیے مختص ہے۔ اگر کسی مخلوق میں کوئی کمال پایا جاتا ہو تو یہ سب اسی واہبُ العطایا کی ایک عطا ہے، یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کسی مخلوق کو منتہائے کمال عنایت ہو، کیوں کہ انتہائے کمال کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ یہ مخلوق قائم بالغیر نہ ہو اور یہ چیز سوائے حق تعالےٰ کے کسی میں ہونی محال ہے۔

[ا] اے عاشقو! اپنی جانیں فدا کرو تا کہ تم ہمارے عشق میں سچے ثابت ہو۔

جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ کمیل محبوب ہوتا ہے اور کمال باعث محبت ہے تو صاف ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی لائق محبت نہیں ہو سکتا، وہی صاحب جمال وکمال ایسا ہے جو اپنی شان میں یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، کوئی اس کے مثل نہیں، غنی ایسا کہ اس کو کسی کی حاجت نہیں، قادر ایسا کہ جو چاہے کرے، جو حکم چاہے دے، نہ کوئی اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے اور نہ اس کی قضا کو رد کر سکتا ہے، اس کے علم کا وہ حال کہ زمین و آسمان کا ایک ذرہ بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔ قاہر ایسا کہ اس کے اختیار سے کوئی شے باہر نہیں، ازلی ایسا کہ اس کے وجود کی ابتدا نہیں، ابدی ایسا کہ اس کی بقا کی کوئی انتہا نہیں، عدم کو اس کی بارگاہ میں راہ نہیں، قیوم ایسا کہ خود اپنی ذات سے قائم اور دوسری تمام اشیاء کا مقوّم، وہی ہے جس کو اپنی عزت و جلال پر ناز ہے جس کو اپنی قدرت وکمال پر فخر ہے، اس کے جلال کی معرفت میں عقلیں متحیر اور دنگ ہیں، اس کی صفتِ کمال میں عارفین ششدر و حیران ہیں، عارفوں کی معرفت کا کمال یہ ہے کہ وہ اس کے کمال کو نہیں جانتے اور انبیاء کی نبوت کی انتہا یہ ہے کہ وہ اس کی ذاتِ بحت کو نہیں پہچانتے۔

ایں چہ مجد و بہاست سبحانہ (صرف ۱۲)	ایں چہ عزیا اعز سلطانہ
اے ہمہ قدسیانِ قدوسی	گردِ کوی تو در زمیں بوسی
دو جہاں جلوہ گاہِ وحدتِ تو	شہد اللہ گواہِ وحدتِ تو
ہم مُقِر با تو گفت و ہم جاحد	لِمَنِ الْمُلْکُ ؕ لِلّٰہِ الْوَاحِدُ!

اسی لیے حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم (منکر ۱۲) نے اعترافاً فرمایا:

لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔	میں تیری وہ تعریف نہیں کر سکتا جو تم نے اپنی ذات کی خود کی ہے۔

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

العجز عن درك الادراك ادراك   تیری پہچان سے عجز عین پہچان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ؎

جز خضوع و بندگی و اضطرار   اندراں حضرت ندارد اعتبار

اب جو شخص حق تعالیٰ سے محبت کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ ان سے محبت حقیقی نہیں ہو سکتی مجازاً ہی ہو سکتی ہے، ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ ان اوصاف کو اوصافِ جمال و محامدِ کمال نہیں سمجھتا یا حق تعالیٰ کو ان اوصاف سے موصوف نہیں مانتا یا ان صفات کو بالطبع باعثِ محبت نہیں جانتا؟ سچ ہے:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے جمال کو اندھوں کی آنکھوں سے چھپا لیا کہ وہ دیکھ نہ سکیں اور اپنے جلال کو ان سے پوشیدہ کر لیا کہ وہ اس سے آگاہ نہ ہوں، یہ دولتِ سرمدی ان ہی خوش بختوں کے حصہ میں رکھی ہے جن کی قسمت میں یہ سعادت روزِ ازل سے لکھ دی گئی اور جن کو آتشِ حجاب سے بچا لیا گیا ہے اور وہ بد نصیب اس سے محروم ہیں جو اندھوں کی طرح اندھیرے میں ٹٹولتے پھرتے ہیں اور دُنیا کی خواہشوں اور شہوتوں کے میدانوں میں جانوروں کی طرح چرتے پھرتے ہیں، اور،

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ   یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے
عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (پ ۲۱ ع ۷)   ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔

جن نیک بختوں کو حق تعالیٰ نے یہ نعمت عطا کی ہے وہ ان بدبختوں کے حال پر افسوس کرتے ہیں جو اس سے محروم ہیں، اور جن کو یہ دولت حاصل نہیں ہوئی وہ ان صاحب دلوں پر ہنستے ہیں جو اس کی خاطر دنیا کی دولت کو چھوڑ بیٹھے ہیں، خود ہی مفلس و قلاش ہیں اور ان کو مفلس سمجھتے ہیں، خود ہی حقیر و ذلیل ہیں اور ان کو حقیر سمجھتے ہیں، خود پریشان حال دنیا کی طلب میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کو پریشان حال

خیال کرتے ہیں! اے کاش اگر ان عاشقانِ الٰہی کی حقیقت ذرا بھی کھل جائے تو وہ دیوانہ وار ان کا دامن پکڑ لیں اور مجنوں کی طرح گھر بار چھوڑ کر ان کے پیچھے ہو لیں! سچ کہا تھا کسی عاشقِ مولےٰ نے:

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند؟ فرزند و عیال و خانماں راچہ کند؟
دیوانہ کنی، ہر دو جہانش بخشی! دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند؟

عارفِ رومی نے اس حالت کی توضیح میں اپنی مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے: ایک مجوسی نے ایک بت خانہ بنایا اور وہاں آگ کا انبار لگا دیا، جو بت کو سجدہ نہ کرتا وہ اس کو اس آگ میں جھونک دیتا۔ ایک مومنہ عورت کو، جس کا بچہ گود میں تھا اس نے پکڑا اور اس سے کہا کہ اس بت کو سجدہ کر، اس "زن پاک دین مومنہ" نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، اس ظالم نے اس کی گود سے بچے کو چھین کر آگ میں ڈال دیا! ماں کا کلیجہ اپنے بچے کی محبت کی آگ میں جل اٹھا اور حالتِ اضطرار میں اس نے بت کو سجدہ کرنا چاہا، بچے نے آگ میں سے آواز دی:

اندر آمادر کہ من ایں جا خوشم گرچہ درصورت میانِ آتشم
اندر آمادر! بہ بیں برہانِ حق تا بہ بینی عشرتِ خاصانِ حق
اندر آو آب بیں آتش مثال از جہانے کہ آتش ست آبش مثال
اندر آ، اسرارِ ابراہیم بیں کو در آتش یافت وَرد و یاسمین
اندر آمادر! بحق مادری بیں کہ ایں آذر ندارد آذری
اندر آمادر کہ اقبال آمدست اندر آمادر، مدہ دولت زدست
اندر آو دیگراں راہم بخواں کاندر آتش شاہ بنہادست خواں
اندر آئید ہمہ پروانہ وار اندریں آتش کہ دارد صد بہار
اندر آئید اے مسلماناں ہمہ غیر عذبِ دیں عذابست آں ہمہ

آب پاکیزہ شیریں ۱۲

اندر آمد مادرِ آں طفلِ خورد   اندر آتش گوئے دولت را برد[1]

مثنوی (دفتر اول)

مولانا کا مقصد اس حکایت سے اس صداقت کو ذہن نشین کرنا ہے کہ عاشقانِ الٰہی یا خاصانِ حق کی ظاہری حالت سے تم یہ نہ سمجھو کہ وہ عذاب میں ہیں، اپنی حالت پر ان کا قیاس نہ کرو، ان کے لیے تو "غیر عذبِ دیں عذاب ست، آں ہمہ" یعنی محبت حق کے پاکیزہ و شیریں پانی کے سوا دنیا کی ساری چیزیں عذاب ہیں، اور وہ اس شرابِ طہور سے مست ہیں اور ان کے دل اس سے مسرور ہیں۔ جاہل کو اس کی خبر نہیں۔

(۵) محبت کا پانچواں سبب باہمی مشابہت و مناکلت ہے۔ یہ مشابہت و مناسبت جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، کبھی ظاہری سبب سے ہوتی ہے اور کبھی غیر ظاہری یا باطنی سبب سے ہوتی ہے۔ انسان میں اور اس کے رب میں باطنی مناسبت پائی جاتی ہے اور اسی وجہ سے انسان کو حق تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے۔ اس باطنی مناسبت کا بیان آسان نہیں، اس میں غلط فہمیوں کا بڑا اندیشہ ہے، ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، من اللہ التوفیق۔

بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خلق آدم علیٰ صورتہٖ   اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اس حدیث میں صورت سے مراد صورت ظاہری نہیں ہو سکتی، جو آنکھ ناک رخسار وغیرہ کی خاص ترکیب کا نام ہے، ورنہ ہمیں ضمیر صورت آدم ہی کی طرف پھیرنی پڑے گی کیونکہ یہ صورت جسم و ہیئت کی صورت ہے اور حق تعالیٰ جو جسموں کے خالق ہیں مشابہت جسمی سے منزہ ہیں، صورۃ سے مراد صورت ظاہری لے کر اور صورت کی ضمیر آدم کی طرف

---

[1] دیکھو مراۃ المثنوی از تلمذ حسین، اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد دکن ۱۳۵۱ھ صفحہ (۲۵) در آتش افگندن بادشاہ نصرانیاں را۔

پھیر کر خلق آدم علی صورتہٖ سے لازماً مطلب یہ ہوگا کہ آدم کو آدم ہی کی صورت پر پیدا کیا جو آدم ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور تمام مخلوقات سے ممیز ہے۔ اس میں جو تکلف ہے، ظاہر ہے۔

صورتہٖ سے مراد "صورتِ معنویہ" بھی ہوتی ہے، اس کا اطلاق ترتیب و ترکیبِ معنوی پر ہوتا ہے، یہ صورت امورِ معنویہ سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: صورتِ واقعہ یہ ہے، یا صورتِ مسئلہ یہ ہے، یعنی اس کی کیفیت یہ ہے، تو ظاہر ہے کہ صورتہٖ سے مراد "کیفیتِ معنوی" ہوئی، اس طرح اگر صورتہٖ سے مراد صورتِ معنوی لی جائے تو اس کی ضمیر کو آدم کی طرف راجع کرنے میں کسی تکلف کی ضرورت نہ رہے گی اور لامحالہ اس کو حق تعالیٰ ہی کی طرف پھیرنا پڑے گا۔ اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جو زیادہ واضح و صریح ہیں:

اِنَّ صورۃَ الانسان علیٰ صورۃِ الرحمٰن[1] انسان کی صورت رحمٰن کی صورت پر ہے۔

اب حدیث خلق آدم علی صورتہٖ کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور صورت سے مراد صورت عقلیہ معنویہ ہے نہ کہ صورت مادیہ جسمی صورتِ عقلیہ کے اعتبارات، ذات، صفات و افعال کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟۔

اب ذات پر غور کرو۔ اس سلسلہ میں امام غزالیؒ کی تحقیقات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے (جو "المضنون بہ علیٰ غیر اہلہ" میں تفصیلاً اور "کیمیائے سعادت" میں اجمالاً موجود ہیں) روح انسانی کی ذات پر غور کرو کہ وہ جسمانی شے نہیں جو بدن میں اسی طرح داخل ہو گئی ہو جس طرح پانی برتن میں اور نہ ہی اس کو عرض قرار دیا جا سکتا ہے جو کسی دوسری شے (جوہر) کے ساتھ قائم ہو جیسے سیاہی کسی سیاہ شے کے ساتھ قائم

[1] دار قطنی فی الصفات، عن ابی ہریرۃؓ

ہے، یا علم عالم کی ذات سے قائم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو متحیز بھی نہیں کہا جا سکتا، یعنی وہ جگہ نہیں گھیرتی، کیونکہ جسم متحیز قابل تقسیم ہوتا ہے، اور روح کسی طرح قابل تقسیم نہیں سمجھی جا سکتی۔

اسی طرح روح نہ انسان کے بدن میں داخل ہے اور نہ اس سے خارج، نہ وہ اس سے متصل ہے اور نہ منفصل، کیونکہ یہ سب باتیں ایسی چیز کے متعلق کہی جا سکتی ہیں جو جسم رکھتی ہو اور وہ متحیز ہو اور روح میں ان میں سے کوئی بات ثابت نہیں۔

روح کو کسی "جہت" یا سمت میں نہیں مانا جا سکتا، اور نہ وہ کسی چیز میں حلول کی ہوئی سمجھی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ صفات بھی یا تو جسمانی شے ہی کے متعلق صحیح ہو سکتی ہیں۔ یا اعراض کے متعلق، اور روح نہ جسم ہے اور نہ عرض۔ اسی طرح روح بے چون و چگونہ و بے کیف و نمونہ ہے اور یہ بعینہ ذاتِ حق تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اسی طرح ذاتِ آدم ذاتِ الٰہی کے مشابہ ہوئی فافہم و تدبّر۔

اسی طرف اشارہ ہے قولِ خداوندی میں:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ	یہ لوگ آپؐ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں آپؐ
مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (پ ۱۵ ع ۱۰)	فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے،

اور اس سے واضح تر دوسری آیت ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ	سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس
مِنْ رُّوْحِيْ۔ (پ۱۴ ع ۳)	میں روح ڈال دوں۔

اور اسی وجہ سے اس کو فرشتوں سے سجدہ کروایا گیا، اور اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں:

اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (پ۲۳ ع ۱۱) ہم نے تجھ کو زمین پر خلیفہ بنایا۔

آدمی خلافتِ الٰہی کا مستحق اسی مناسبت کی وجہ سے ہوا جو اس کی ذات کو حق تعالیٰ کی

ذات سے ہے۔

اب صفاتِ روحِ انسانی پر غور کرو: یہ صفات علم، ارادہ، قدرت، سمع، بصر وکلام ہیں، اور یہی صفات حق تعالےٰ کے بھی ہیں، اس صورت میں بھی آدم کی صفات حق تعالیٰ کی صفات سے مشابہ ہوئیں، فافہم وتدبر۔

آخر میں افعالِ روحِ انسانی پر غور کرو۔ امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت وغیرہ میں اس کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

انسان کے فعل کا آغاز خواہش اور ارادے سے ہوتا ہے۔ پہلے اس کا اثر قلب میں ظاہر ہوتا ہے، پھر دماغ پر ہوتا ہے، اس سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں جن کا منبع دماغ ہے، پھر ان سے اوتاد اور رباطات اثر لیتے ہیں جو ہر جوڑ سے لگے ہوئے ہیں اور ان سے انگلیاں حرکت کرتی ہیں اور ان سے (مثلاً) قلم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ صورت جس کو انسان کاغذ پر لکھنا چاہتا ہے ظہور میں آتی ہے۔

افعالِ انسانی کی ان تفصیلات پر غور کرنے سے افعالِ الٰہی کی کیفیت بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔ جس طرح انسان کا تصرف اس کے اپنے بدن پر ہوتا ہے جس کو "عالم صغیر" سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح خالق اکبر کا تصرف "عالم کبیر" (کائنات) پر جاری ہے۔ دیکھو ارادۂ انسانی کو جو نسبت قلبِ انسانی سے ہے وہی "الٰہ" کو عرش سے سمجھی جاسکتی ہے اور قلبِ انسانی کو دماغ سے جو نسبت ہے وہی عرش کو کرسی سے مانی جاسکتی ہے۔ حواسِ انسانی کو ذاتِ انسانی سے جو نسبت ہے وہی فرشتوں کو ذاتِ الٰہی سے قرار دی جاسکتی ہے، جس طرح حواس انسان کے مطیع ومنقاد ہیں اسی طرح ملائک حق تعالیٰ کی اطاعت پر مجبور ومجبول ہیں[1]

اس مختصر توضیح سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ذات وصفات وافعالِ انسانی

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھو: کیمیائے سعادت، فارسی مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ص ۲۵۔

ذات وصفات وافعالِ الٰہی سے مشابہ ہیں اور یہی مشابہتِ معنوی صورۃِ حقیقی ہے جس کا "خلق آدم علٰی صورتہ" میں ذکر آیا ہے۔ آدم مظہرِ ذات وجامع صفاتِ الٰہیہ ہے اسی لیے قرآنِ حکیم میں ذکر ہے: خلقت بیدایَّ (پ ۲۳ ع ۱۴) (اس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا[1]) یہ دو ہاتھ جلال وجمالِ الٰہی ہیں یعنی انسان حق تعالیٰ کی ذات کا مظہرِ تام ہے، اور جمیع صفاتِ الٰہیہ کا جامع ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا:

خلق آدم علٰی صورتہ ووجہہ	یعنی آدم کی تخلیق صفات اللہ وذاتِ
(طبرانی من ابی ہریرہ)	اللہ پر ہوئی ہے۔

اسی سلسلے میں اگر تم حق تعالیٰ کے اس قول پر کہ:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ	ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں آفاق
وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ	میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں
أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (پ ۲۵ ع ۱)	بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔

نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انفس کو آفاق پر عطف فرمایا ہے (حرف و کے ساتھ) یعنی جو آیات یا صفات اللہ آفاق یا کائناتِ خارجی میں ظاہر ہیں وہی آیات و صفات نفس آدم میں بھی موجود ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ کائنات خارجی میں یہ من حیث التفرق اور نفس انسانی میں من حیث الجمع ہیں۔ اسی لیے انسان جس کو عالمِ صغیر سے تعبیر کیا گیا ہے، خلاصۂ عالمِ کبیر قرار دیا جاتا ہے، اسی جامعیتِ صفات کے اعتبار سے انسان کو اپنی صورت سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور ظہورِ صفات کی صورت کا نام آدم (یا انسان) رکھا گیا ہے۔

صورت دراصل نام ہے اس محل کا جس میں حقیقت مخفی و مستتر ہوتی ہے لیکن اپنا اظہار اسی کے ذریعے کرتی ہے۔ تو سماکی مثال سے اس اجمال کی وضاحت

---

[1] اور حدیث میں آیا ہے: خلق آدم بیدہ لا، یعنی آدم کا پتلا اپنے ہاتھ سے بنایا۔

ہو سکتی ہے، دیکھو، نور ظہورِ الوان کی حقیقت ہے، - - - - - - - - - - - -
کیونکہ نور کے بغیر ظہورِ الوان ممکن نہیں، الوانِ ظہورِ نور کا محل ہیں۔ بالفاظِ دیگر نور ہی بصورتِ الوان ظاہر ہوتا ہے، لیکن صورتِ الوان میں مخفی و مستتر ہوتا ہے اور باوجود ظہور کے باطنِ الوان کہلاتا ہے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ نور ظہورِ الوان کی حقیقت ہے اور مختلف الوان کی یہ صورتیں عارض ہیں۔ ان عوارضات کو صفاتِ نور قرار دیا جا سکتا ہے یا صفاتِ صورتِ نور، صورتِ الوان کے ظہور سے حقیقتِ نور مستور ہو جاتی ہے۔

نور کی اس مثال سے تمہیں یہ صاف طور پر ظاہر ہو جائے گا کہ کس طرح آدم کو حق تعالیٰ کا آئینۂ صورت قرار دیا جا سکتا ہے جو خود بے صورت ہیں جل جلالہٗ وعظم شانہٗ:

جز یکے نیست نقشِ ایں عالم | باز بیں و باعالمش مفروش
گلِ ایں باغ را توی غنچہ | سرِ ایں گنج را توی سرپوش
پردہ بردار تا بہ بینی خویش | دوست با دوست ہم آغوش
آں شناسد حدیث ایں دلِ مست | ہر کہ ایں بادہ کردہ باشد نوش

عارف جانتا ہے کہ یہ صورت اسی معنیٔ مطلق ہی کی صورت ہے، لہٰذا وہ اپنی ذات میں ذاتِ مطلق کا، اپنی صفات میں صفاتِ حق کا اور اپنے افعال میں افعالِ خالق کا مشاہدہ کرتا ہے اور فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (پ ۲۶ ع ۱۸) کی تنبیہ سے پوری طرح فائدہ حاصل کرتا ہے تاکہ

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ[1] جس نے اپنی ذات کو پہچانا وہ اپنے رب کو پہچانا۔

---

[1] اس قول کو ابن حجر مکی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول قرار دیا ہے، لیکن دیلمیؒ نے اس کو حدیث قرار دیا ہے، امام غزالیؒ اور امام محی الدین ابن عربیؒ نے اس کا حدیث ہونا مانا ہے۔ اسی مفہوم کو یاوردیؒ نے (باقی صفحہ ۹۲ پر)

کا قول پوری طرح صادق آئے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اسی مناسبت کی طرف اشارہ ہے اس قول میں کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: مرضت ولم تعدنی ہم بیمار ہوئے اور موسیٰؑ تم نے عیادت نہ کی۔ موسیٰؑ حیران ہوئے اور پوچھا: بار الہا، کیا آپ بھی بیمار ہوتے ہیں؟ جواب ملا کہ ہمارا فلاں بندۂ خاص بیمار ہوا، اگر تم اس کی عیادت کرتے تو ہمیں وہیں پاتے! رومیؒ نے حق تعالیٰ کے جواب کو اس طرح پیش کیا ہے:

گفت آرے بندۂ خاص گزیں ۔۔۔ گشت رنجور، او منم، نیکش بہ بیں
ہست رنجوریش رنجوریٔ من ۔۔۔ ہست معذوریش، معذوریٔ من!

(مثنوی دفتر دوم)

بندۂ خاص و برگزیدہ کو جو مناسبت حق تعالیٰ سے ہوتی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر رومیؒ فرماتے ہیں:

ہر کہ خواہد ہم نشیند با خدا ۔۔۔ گو نشینی در حضورِ اولیا!
از حضورِ اولیا گر بگسلی ۔۔۔ تو ہلاکی، زانکہ جزوی بے کلی
ہر کرا دیو از کریماں وابُرد ۔۔۔ بے کسش یابد سرش را او خورد

خاص بندوں کی حق تعالیٰ سے جو مناسبت ہوتی ہے اس کی وضاحت کے لیے عارفِ رومیؒ، بایزید بسطامیؒ کا قصہ اپنی مثنوی میں نقل فرماتے ہیں: ایک مرتبہ

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) دوسرے الفاظ میں حضرت عائشہؓ سے اس طرح روایت کی ہے اذا قالت یا رسول اللہ! متی یعرف الانسان ربہ؟ قال: اذا عرف نفسہ، یعنی صدیقہؓ نے پوچھا: "یا رسول اللہؐ انسان اپنے رب کو کب پہچانتا ہے؟" فرمایا "جب وہ اپنے نفس کو پہچانتا ہے"۔ پوری حدیث کی روایت مسلم نے کی ہے: یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی، یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی، یا ابن آدم استسقیتک فلم تسقینی، یعنی اے ابن آدم میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہیں کی، اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے مجھے نہیں کھلایا، اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے مجھے نہیں پلایا۔

بایزید حج کے ارادے سے چلے، ان کا قاعدہ تھا کہ جس شہر میں جاتے بندگانِ خاص کی جستجو کرتے اور جو مل جاتا اس کی زیارت کرتے۔ چنانچہ ایک سفر میں ایک مقام پر:

دید پیرے با قدے ہمچوں ہلال ۔۔۔ دید دروے فرّ و شانِ ذوالجلال
بایزید او را چو از اقطاب یافت ۔۔۔ مسکنت بنمود و در خدمت شتافت
گفت عزم تو کجا اے بایزید؟ ۔۔۔ رخت غربت را کجا خواہی کشید؟

حضرت بایزید نے کہا: حج کو جاتا ہوں، شیخ نے پوچھا: "کچھ پاس بھی ہے؟" جواب دیا: "دو سو درہم ہیں۔"

گفت طوفے کن بگردم ہفت بار ۔۔۔ ایں نکوتر از طواف حج شمار
واں درمہا پیش من نہ اے جواد! ۔۔۔ داں کہ حج کردی و حاصل شد مراد
عمرہ کردی عمر باقی یافتی ۔۔۔ صاف گشتی بر صفا بشتافتی
حق آں حقے کہ جانت دیدہ است ۔۔۔ کہ مرا بر بیت خود بگزیدہ است
کعبہ را یک بار بیتی، گفت یار ۔۔۔ گفت یا عبدی مرا ہفتاد بار
چوں مرا دیدی، خدا را دیدۂ (میرا گھر) ۔۔۔ گرد کعبۂ صدق بر گردیدۂ
چشم نیکو باز کن در من نگر ۔۔۔ تا بہ بینی نورِ حق اندر بشر
بایزید آں نکتہا را ہوش داشت ۔۔۔ ہمچو زریں حلقہ اش در گوش داشت
آمد از وے بایزید اندر مزید ۔۔۔ منتہی در منتہی آخر رسید

پس حق تعالیٰ کے ایسے خاص الخاص بندے بھی ہوتے ہیں جن کو ان سے اس درجہ مناسبت ہوتی ہے۔ لیکن یہ خاص مناسبت اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب بندہ فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل پر مواظبت کرتا ہے اور حق تعالیٰ سے تقرب چاہتا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لا یزال العبد یتقرب الی بالنوافل ۔۔۔ ہمیشہ بندہ نوافل سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے

حتی احببتہ واذا احببتہ کنت	یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور
سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ	جب میں اس کو چاہتا ہوں تو میں اس کا کان
الذی یبصر بہ ، ویدہ الذی	ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور میں اس
یبطش بھا ورجلہ التی یمشی	کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور
بھا (الحدیث رواہ البخاری)	اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے
	اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے.

بعض روایات میں ہے:

فوادہ الذی یعقل بہ ولسانہ الذی	اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ سمجھتا ہے
یتکلم بہ . (شرح مشکوٰۃ)	اور زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بات کرتا ہے.

یہ وہ مقام ہے جہاں زیادہ گفتگو نہ کرنی چاہیے، یہ مزلۃ الاقدام ہے، بہت سے لوگ یہاں گمراہ ہو گئے ہیں، سچ ہے:

در نیابد حال پختہ ہیچ خام بس سخن کوتاہ کن باید والسلام
آنچہ می گویم بقدر فہم تست مردم اندر حسرت فہم درست (رومیؒ)

ہماری اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ محبت (یا افراط محبت جو عشق ہے) کے قلب انسانی میں پیدا ہونے کے پانچ ہی سبب ہیں: محبت نفس، احسان، کمال، جمال، نسبتِ ظاہری و باطنی، یہ سارے اسباب دمقتضیات حق تعالیٰ میں کامل طور پر جمع ہیں لہٰذا محبت یا عشق کے مستحق صرف حق تعالیٰ ہی ہیں اور ارباب بصیرت کے نزدیک قابلِ پذیرائی صرف محبت الٰہی ہے عارفِ رومیؒ نے بجا طور پر فرمایا تھا:

عشق زندہ در روان و در بصر ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر
عشق آں زندہ گزیں کو باقیست وز شراب جاں فزایت ساقیست
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیا یافتند از عشق او کار و کیا!

آگے چل کر فرماتے ہیں:

عشق بر مردہ نباشد پائیدار
عشق را بر حیئ جاں افزائے دار

عشق زاوصاف خدائے بے نیاز
عاشقی بر غیر او باشد مجاز

زانکہ آں مس زر اندود آمد است
ظاہرش نور اندروں دود آمد است

چوں شود نور و شود پیدا دُخان
بفسرد عشق مجازی آں زماں

محبت کے اسباب و موجبات پر روشنی ڈالنے کے بعد، اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ حقیقی محبت یا عشق تو صرف حق تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیے، اب ہم ان دلائل شرعیہ پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں جو تخلّق بحب اللہ اور سعی فی تحصیل حب اللہ کے سلسلے میں ملتے ہیں۔ یہ ہم اپنی اس تالیف کے تیسرے باب میں کریں گے۔

باب (۳)

عشقِ حقیقی اور دلائلِ شرعیہ

عشقِ حقیقی کا مقام

اُمّتِ مرحومہ اور تمام ادیان و ملل اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کو حق تعالیٰ سے محبت فرض ہے، باوجود اس اقرار کے بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ محبت الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ اس کی اطاعت پر مواظبت (پابندی) کی جائے، اور بندہ اس پر توفیق پائے محبت میں تو جنسیت و مثلیت ضروری ہے تاکہ ایک کو دوسرے کی طرف میل ہو، جیسا کہ مشہور و مسلّم ہے: الجنس الی الجنس یمیل، فانی کو باقی کے ساتھ جنسیت میں اشتراک کیسے ہو سکتا ہے؟

کے بود سیمرغ را پروائے من ۔۔۔ کس بود فردوس اعلیٰ جائے من
در وصال او چہ تواہم رسید ۔۔۔ بر محل ایں راہ نتواہم برید!

اس کا جواب تو عام طور پر یہی دیا جاتا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت فرض ہے، اور جس چیز کا وجود ہی نہ ہو وہ فرض کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟ اور محبت کی تاویل اطاعت سے کیسے کی جا سکتی ہے کہ اطاعت تو محبت

کی تابع ہوتی اور اس کا ثمرہ ہوتی ہے، پہلے محبت کا وجود ہو تو پھر محبوب کی اطاعت ہو، اسی لیے تو رابعہ عدویہؒ نے کہا تھا:

لو کان حبك صادقا لاطعتہ ـ اِنَّ المحب لمن یحب مطیعٌ[1]

اور یہی اختلاف مسئلہ عشق میں بھی پایا جاتا ہے، جو محبت کو جائز نہیں سمجھتے، وہ عشق کو بھی جائز نہیں سمجھتے، کیونکہ عشق فرطِ محبت کا نام ہے اور جو محبت کو جائز سمجھتے ہیں وہ عشق کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور وہی خاصانِ حق ہیں:

اسرار خرابات بجز مست ندانند ـ ہشیار چہ داند کہ دریں کوے چہ رازست
(یعنی عالم معنی ۱۲) (سالک مستغرق ۱۲)

خواہی کہ درونِ حرم عشق خرامی ـ درمیکدہ بہ نشیں کہ رہِ کعبہ درازست
(باطن عارف کامل ۱۲) (یعنی ہو بینا مُعتقد ۱۲)

(عراقی)

جنسیت کے مشترک نہ ہونے کی وجہ سے محبتِ الٰہی کا جو انکار کرتے ہیں ان کے جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حق تعالےٰ کسی بندہ کو اپنی محبت کی سعادت عطا فرماتے ہیں تو پہلے اس کو اپنی صفات میں سے بعض صفات سے موصوف کرتے ہیں اور پھر اپنا انس دیتے ہیں، اس طرح جنسیتِ صفاتی پیدا ہوتی ہے چنانچہ قرآنِ کریم کی یہ آیت یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ جنسیت صفاتی پر دلالت کرتی ہے۔

بہر حال قرآن حکیم اس محبت کا اثبات کرتا ہے اور صاف طور پر اس کا اعلان کرتا ہے! ان آیاتِ کریمہ پر غور کرو۔

(۱) یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (پ۶ ع۱۲) حق تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں۔

(۲) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (پ۲ ع۴) جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔

---

[1] اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی ضرور اطاعت کرتا کیونکہ محب اپنے محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کا وجود ہے اور اس میں تفاوت بھی ہوتا ہے :

(۳) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ - (پ ۳ ع ۱۲) اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعم تم سے محبت کرنے لگیں گے ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور وہ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں ،

(۴) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا - (پ۱۶ ع ۹) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اللہ تعم ان کے لیے محبت پیدا کر دے گا ۔

یعنی ان سے محبت کرے گا ، ان کے دل میں اپنی محبت پیدا کر دے گا - (موضح القرآن)

(۵) قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔

آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بی بیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعم اپنا حکم بھیج دیں اور اللہ تعم بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتے ۔

یہ گویا ایک تہدید ہے مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر ابھارا گیا ہے ۔

قرآن حکیم کی ان صاف صریح آیات سے اب اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حق تعالےٰ اپنے بندوں سے محبت کرتے ہیں اور ہر بندے کو ان سے محبت فرض ہے ۔

اب ذرا حق تعالیٰ[1] کے اس نام کے معنی پر غور کرو جو اسلام نے عَلَم کے طور پر ان کا مقرر کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے۔ اللہ کا لفظ اصل میں کس مادہ سے ماخوذ ہے، اس میں اہلِ لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا خیال ہے کہ یہ ولاہٌ سے نکلا ہے ولاہٌ اور وَلَہٌ کے اصل معنے عربی میں اس غم محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسی سے بعد کو مطلق "عشق و محبت" کے معنی پیدا ہوگئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے۔ اسی لیے "اللہ" کے معنے "محبوب اور پیارے" کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ کائنات کے دل سرگرداں متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی قرآنِ مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ ہندی میں "من موہن" یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمٰن و رحیم ہیں، ان دو لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنے ہیں، یعنی رحم والا، مہربان، لطف و کرم والا، پھر یہی اوصاف بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (محبوب، مہربان رحم والا) قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے۔ لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا عَلَم بھی لفظ رحمٰن ہے جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ — اس کو محبوب کہو یا مہربان کہو، جو کہہ کر اس کو
اَیًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی (پ۱۵ ع۱۲) — پکارو اس کے سب ہی نام اچھے ہیں۔

قرآن مجید نے "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کی صدہا بار کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳ موقعوں

[1] یہاں سے ہم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مقالہ "بشریٰ" سے استفادہ کر رہے ہیں جو رسالہ بینات (کراچی) میں دسمبر ۱۹۶۳ء میں چھپا، جلد ۳، عدد ۱۰۔ حذف و اضافہ کے ساتھ، مواد یہیں سے لیا گیا ہے۔

پر خدا کو اس نام سے پکارا ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالےٰ کے بیسیوں اوصافی نام ہیں، احادیث میں ننانوے گنائے گئے ہیں۔ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں، لیکن استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہیں ناموں کی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم، مہر و محبت کا اظہار ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف اَلْوَدُوْدُ (سورۂ ذات البروج) میں آیا ہے جس کے معنے "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق و پیار ہے۔ اس کے سوا ایک اور نام اَلْوَلِیُّ ہے جس کے لفظی معنی یار اور دوست کے ہیں۔ خدا کا ایک اور نام قرآنِ مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے وہ اَلرَّؤُفُ ہے۔ رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے اور رافت کے معنی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے اسی طرح خدا کے لیے قرآن میں ایک اور نام حنّان آیا ہے۔ جو حنّ سے مشتق ہے۔ حنّ و حنین اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ یہ الفاظ ان مجازی و مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں، جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں۔ دیکھو وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت و پیار کے جو خاص جذبات ہیں، ان کو خدا کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے، اس طرح مادیت و جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معانی کی تلقین کر رہا ہے۔

ان کے علاوہ قرآنِ مجید و احادیث صحیحہ میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات مذکور ہیں ان کو بھی اس موقع پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس کا نام غفّار (بخشش کرنے والا) غَفُوْر (بخشنے والا) سلام (امن و سلامتی) کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لیے امن و سلامتی ہے، پھر وہ مُؤمِن (امن دینے والا) اَلعَدْل

یعنی سرتاپا انصاف ہے اَلْعَفُوُّ (معاف کرنے والا) ہے اَلْوَهَّابُ (عطا کرنے والا) اَلْحَلِيْمُ (بردبار) اَلصَّبُوْرُ (بندوں کی گستاخی پر صبر کرنے والا) اَلتَّوَّابُ (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) اَلْبَرُّ (نیک اور مجسم خیر) اور اَلْمُقْسِطُ (منصف اور عادل) ہے۔ اب ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ ان تمام ناموں سے خدا کی محبت کا ہر گوشہ نمایاں ہو رہا ہے!

اب قرآنِ حکیم بتلاتا ہے کہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو حق تعالےٰ کی محبت کی دولت ملی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (پ ع ۸)	خدائے تعالےٰ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ۔ (پ ع ۲۸)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (" ")	اور پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (پ ع ۸)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (پ ع ۱۰)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (پ ع ۱۶)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ (پ ع ۹)	خدا اُن کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستے میں لڑتے ہیں۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (پ ع ۶)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

دیکھو محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر، عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے، اس کا نام رحم اور رحمت ہے، اب حق تعالےٰ تمام تر رحم ہیں، ان کی رحمت کے فیض سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ سیراب ہو رہا ہے، ان کا نام رحمٰن و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے وہ سب ان کی رحمت کا ظہور ہے۔ وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔ اسی لیے ان کی رحمت سے ناامیدی جرم ہے اور مایوسی گناہ ہے اور گناہ گار سے گنہگار کو وہ نوازنے

کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہیں۔ گنہ گاروں اور مجرموں کو وہ "یا عبادِی" میرے بندے" کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتے ہیں۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (پ۲۴ ع۳)

آپ کہہ دیجیے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف فرمائیگا، واقعی وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْقَانِطِیْنَ (پ۱۴ ع۴) ناامیدوں میں سے نہ ہو۔

حق تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کرلی ہے اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے:

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (پ۷ ع۸) اللہ تعالےٰ نے از خود اپنے اوپر مہربانی کرنے کو لازم کرلیا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (پ۹ ع۹) اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

حضرت یحییٰ منیری کے اس نکتہ پر بھی غور کرو اور محظوظ ہو: آپ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے گناہ گاروں سے خطاب فرمایا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا (اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں) یہ نہیں فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اَطَاعُوْا (جنھوں نے اطاعت کی ہے) یا یہ نہیں کہا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ تَابُوْا (جنھوں نے توبہ کی) یا یہ نہیں کہا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے) بلکہ فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا، اس خطاب ہی سے حق تعالیٰ کی رحمت و رافت و محبت کا اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اسی بشارت سے مست ہوکر مستی کے عالم میں کسی نے کہا ہے:

چوں مغفرت است وعدۂ حضرتِ دوست

از کردہ گناہِ من چہ باک است مرا!

قرآنِ مجید سے حق تعالےٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت اور رحمت کا یہ حال معلوم کرنے کے بعد اب احادیثِ نبوی صلعم کی طرف توجہ کرو تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی محبتِ الٰہی کو شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔

یعنی جس دل میں حق تعالیٰ کی محبت نہ ہو وہ ایمان سے خالی ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں: ایمان کی اصل حبِ الٰہی ہے!

(۱) ابو رزین العقیلیؓ نے پوچھا، یارسول اللہ:

ما الایمان؟ قال ان یکون اللہ ورسولہ احبّ الیک مما سواھما۔	یعنی، ایمان کیا چیز ہے؟ فرمایا: اللہ اور اس کے رسول کا تیرے نزدیک ماسوا سے زیادہ محبوب ہو جانا ایمان ہے۔

(۲) بخاری و مسلم میں بروایت انسؓ آیا ہے:

لا یؤمن احدکم حتی یکون اللہ ورسولہ احبّ الیہ مما سواھما۔	تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک ماسوا سے زیادہ محبوب نہیں ہو جاتے۔

اور ایک روایت میں مِنْ نَفْسِہٖ بھی آیا ہے یعنی جب تک اللہ اور اس کا رسول اس کی ذات سے زیادہ عزیز و محبوب نہیں ہو جاتا۔

(۳) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حق تعالےٰ سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

اَحِبّوا اللہ لما یغذوکم بہ من نعمۃ واحبونی لحب اللہ	تم اللہ تعالیٰ سے محبت اس وجہ سے کرو کہ وہ تم کو ہر صبح اپنی نعمت سے سرفراز کرتا ہے اور مجھ سے اس لیے محبت کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

(ترمذی بروایت ابن عباس)

(۴) ابو نعیم نے حلیہ میں روایت کی ہے کہ حضور انور صلعم نے مصعب بن عمیرؓ کو آتے ہوئے دیکھا کہ وہ ایک مینڈھے کی کھال لپیٹے چلے آرہے ہیں، آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

انظروا الی ھذا الرجل قد نور اللہ قلبہ، لقد رایتہ بین ابویہ یغذوانہ باطیب الطعام والشراب، فدعاہ حب اللہ ورسولہ الی ماترون۔	اس شخص کو دیکھو، اللہ تعالیٰ نے اس کا دل منور کر دیا ہے، میں نے اس کو اس کے ماں باپ کے ہاں دیکھا تھا کہ اس کو بہترین غذا و مشروب دیا کرتے تھے، پھر اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے اس کو آواز دی اور اس کا یہ حال ہوگیا جو تم دیکھتے ہو۔

(۵) ایک مشہور حدیث ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا جب وہ ان کی روح قبض کرنے وارد ہوئے:

ھل رأیت خلیلا یمیت خلیلہ۔	بھلا تم نے ایسا دوست دیکھا ہے جو اپنے دوست کو مارے۔

حق تعالیٰ نے ملک الموت کو وحی فرمائی کہ کہہ

ھَلْ رَأَیْتَ محبا یکرہ لقاء حبیبہ۔	کیا تم نے ایسا محب بھی دیکھا ہے جو اپنے حبیب کی ملاقات کو بُرا جانے۔

حضرت ابراہیمؑ نے ملک الموت سے فرمایا: الآن فاقبض، ہاں اب میری روح قبض کر۔ یہ بات وہی شخص جانتا ہے جس کو حق تعالیٰ سے دلی محبت ہوتی ہے۔ جب وہ یہ

جان لیتا ہے کہ موت اس کے محبوب سے ملاقات کا سبب ہوتی ہے تو اب وہ ذوق وشوق کے ساتھ موت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا:

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (پ ۲۸ ع ۱۱) — تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

کس شوق سے مولانائے رومؒ موت کی تمنا کرتے ہیں:

چوں تمنّوا موت گفت اے صادقین — صادقم جاں را برافشانم بریں
(موت کی تمنا کرو)

جانہائے بستہ اندر آب وگل — چو رہند از آب وگلہا شاد دل

در ہوائے عشقِ حق رقصاں شوند — ہمچو قرصِ بدر بے نقصاں شوند

اے حریفاں من از آنہا نیستم — کز خیالاتے دریں راہ ایستم

مردن ایں ساعت مرا شیریں شد است — "بَلْ هُمْ اَحْيَاءٌ" پے من آمد است
(بلکہ وہ زندہ ہیں)

اقتلونی یا ثقاتی لائماً — انّ فی قتلی حیاتی دائماً!

اے بزرگو مجھے الزام رکھ کر قتل کردو — بیشک میرے قتل کیے جانے پر میرے لیے دائمی زندگی ہے

(۶) بخاری و مسلم میں ابوہریرہؓ سے رفعًا روایت ہے:

اِنَّ اللہ اذا احب عبدا دعا جبریل فقال انی احب فلانا فاحبہ، فیحبہ جبریل، ثم ینادی فی اھل السماء فیقال ان اللہ یحب فلانا فاحبوہ فیحبہ اھل السماء، ثم یوضع لہ القبول فی الارض۔

جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو چاہتے ہیں تو جبریل کو پکارتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندہ کو چاہتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ، جبریل اس سے محبت کرتے ہیں اور پھر آسمانوں والوں میں منادی کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت رکھتے ہیں تم سب اس سے محبت رکھو، پھر اس بندہ کے لیے زمین پر ہر دلعزیزی و قبولیت کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔

دیکھو کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے کس اعلان اور اشتہار کے ساتھ محبت فرماتے ہیں۔

کیا اب بھی منکرینِ محبت اپنی بات پر جمے رہیں گے اور حق تعالےٰ کی محبت کا انکار کریں گے؟
اس حدیث کو مفسرین نے اس آیت قرآنی کی تفسیر قرار دی ہے، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (پ۱۶ ع۹)

(۷) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک صحابی کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا تھا، وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر نماز میں ہر سورۃ کے آخر قل ھو اللہ ضرور پڑھا کرتے، جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو انھوں نے کہا:

لانها صفة الرحمٰن فانا احب ان اقرأ بها: — اس سورۃ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔

آنحضرت نے فرمایا: ان کو خبر کر دو کہ: اِنَّ اللہ تعالیٰ یُحِبُّہٗ، اللہ تعالیٰ بھی ان سے محبت کرتے ہیں (متفق علیہ)

(۸) روایت کی جاتی ہے کہ ایک اعرابی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "یا رسول اللہؐ قیامت کب ہوگی؟" آپؐ نے فرمایا: "تو نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے؟" نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کیا: "یا رسول اللہ میرے پاس نہ تو نمازوں کا، نہ روزوں کا، اور نہ صدقہ وخیرات کا ہی ذخیرہ ہے، جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسولؐ کی محبت کا ہے اور بس!" آپؐ نے فرمایا: "المرء مع مَنْ اَحَبَّ: جو جس کو چاہے گا وہ اسی کے ساتھ رہے گا۔" حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو اسلام کے بعد کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا، جتنے کہ وہ اس بات سے خوش ہوئے (کیونکہ وہ سمجھ گئے کہ صرف خدا اور رسولؐ کی محبت تمام نیکیوں کا بدل اور معاوضہ ہے) (بخاری ومسلم بروایت انس)

(۹) ہم نے اس کتاب کے دوسرے باب میں حدیثِ قربِ نوافل نقل کی ہے کہ

حق تعالیٰ فرماتے ہیں : میرا بندہ اپنی طاعتوں سے میرا قرب اس قدر ڈھونڈھتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہانتک کہ میں اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے ......"

اس حدیث سے یہی صاف ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔

(۱۰) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنی دعامیں مانگتے ہیں :

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی حُبَّكَ وحُبَّ مَنْ	الٰہی مجھ کو اپنی محبت عطا کر اور اس کی محبت
احبّكَ وحُبَّ مَا يُقَرِّبُنِی اِلیٰ حُبِّكَ	جو تجھے چاہتا ہے، اور اس شے کی محبت جو تیری
وَاجعل حُبَّكَ احبَّ اِلَيَّ من الماءِ	محبت سے مجھے قریب کردے اور اپنی محبت کو
البارد . (احمد، ترمذی، حاکم)	میرے لیے آبِ سرد سے زیادہ محبوب کر۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہوتا ہے، لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی وہ صرف محبتِ الٰہی ہی کا زُلالِ خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا۔ آپ اپنی خشوع وخضوع کی دعاؤں میں اور خلوت کی ملاقاتوں میں اسی محبت کا سوال کرتے ہیں :

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی حُبَّكَ وحُبَّ	خداوندا تو مجھے اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت
من ينفعنی فی حُبِّكَ (ترمذی)	کی راہ میں نافع ہو روزی فرما!

(۱۱) لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچّہ سے، بچّہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، اس میدانِ حشر میں اس کا بچّہ گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کو سامنے نظر آجاتا ہے، اپنے بچّے کے جوشِ محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے۔ رحمۃٌ للعالمین

کی نظر پڑتی ہے۔ صحابہؓ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچے کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟ صحابہ نے عرض کی: "ہرگز نہیں" فرمایا: تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچے سے ہے، خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بھی بہت زیادہ محبت ہے۔ (صحیح بخاری، باب رحمۃ الولد)

(۱۲) ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ ایک عورت اپنے بچے کو گود میں لیکر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے: "یارسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟" فرمایا: "ہاں بیشک اس سے زیادہ ہے" بولی: "تو کیا ماں اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا کرے گی؟" یہ سن کر فرطِ اثر سے آپؐ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر سر اٹھاکر فرمایا: "خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے"

(سنن نسائی، باب ما یرجی من الرحمۃ)

(۱۳) آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں۔ ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں اور واقعہ عرض کرتے ہیں: "یارسول اللہ، میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھاکر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آکر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی" ارشاد ہوا: "کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد، باب رحمۃ اللہ)[1]

---

[1] ۱۱، ۱۲، ۱۳ میں جو احادیث پیش ہوئی ہیں وہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مقالہ "بشریٰ" سے ماخوذ ہیں جو رسالہ بینات میں دسمبر ۶۳ء میں شایع ہوا۔ یہ ماہنامہ کراچی سے نکلتا ہے۔ جلد ۳، عدد ۱، احادیث اور ان کی تشریح علامہ ہی کے قلم سے ہے۔

اور جن آیاتِ قرآنیہ و احادیثِ نبویہ کا ہم نے ذکر کیا ہے ان سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ اپنے بندوں سے محبت کرتے ہیں اور بندوں کو حق تعالےٰ سے محبت ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ محبت اور اطاعت میں فرق ہے۔

اطاعت صرف ثمرۂ محبت اور نتیجۂ محبت ہے نہ کہ اصل حقیقتِ محبت"

بات اصل یہ ہے کہ جو لوگ محبت کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ خود بادۂ محبت کے مزے سے بے خبر ہیں، اور گو مردِ عاقل اس سخنِ آشنا سے دیوانہ ہے اور افسونِ محبت اس کے نزدیک محض افسانہ! لیکن،

دل شناسد کہ چیست جوہرِ عشق، عقل را زہرۂ بصارت نیست!

پروانہ ہی جانتا ہے کہ تلخئ دودۂ شمع میں کیا حلاوت ہے اور دیوانے ہی کو معلوم ہے کہ زنجیر کی جھنکار میں کیا کیفیت ہے؟

تو نازنینِ جہانی و ناز پروردہ ترا ز سوزِ درون و نیازِ ما چہ خبر؟
چو دل بمہر نگارے نہ بستۂ اے مہ ترا ز حالتِ عشاقِ بے نوا چہ خبر؟

قرآنِ حکیم اور احادیث صحیحہ سے حق تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت اور بندوں کی حق تعالیٰ سے محبت یا عشقِ حقیقی کا یہ حال معلوم کر کے اب چند اکابر اولیاء کی باتوں پر بھی غور کرو جو انہوں نے محبت الٰہی کے سلسلے میں کہی ہیں اور ان کا حال دیکھو جو اس محبت کے نتیجہ میں ہوا:

(۱) سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

من ذاق من خالص محبۃ اللہ	جس نے اللہ جل شانہ کی خالص محبت
تعالیٰ شغلہ ذالک عن طلب الدنیا	کا مزہ چکھا وہ دنیا کی طلب نہ کرے گا اور
واوحشہ عن جمیع البشر	سب آدمیوں سے وحشت کرنے
(احیاء العلوم، ج ۴، ص ۱۵۹)	لگے گا۔

سچ کہا ہے عاشقِ صادق نے:-

خوابِ راحت شد ازاں دیدہ کہ دیدن دانست
رفت آسائش ازاں دل کہ طپیدن دانست

یہی عاشقِ صادق کی علامت ہے کہ اس کی نظر میں محبوب کے سوا کوئی اور نہ سمائے اور سبھوں سے اس کا تعلق کٹ جائے، کوئی خواہش اس کے دل میں نہ رہے، اس کا مطلوب ومقصود ومراد صرف محبوب ہو، اسی لیے جو عاشقِ مولی ہوگا اس کو دنیا سے کوئی علاقہ نہ ہوگا، طالبِ مولی طالبِ دنیا نہیں ہوتا۔

(۲) حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالی کی مخلوقات میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کو جنت اور اس کی نعمتیں اللہ تعالی کے ذکر سے باز نہیں رکھتیں تو ان کو دنیا اس سے کب باز رکھ سکے گی؟

قبلۂ و محرابِ من ابروئے دلدار است وبس
این دلِ شوریدہ را بایں چہ وباآں چہ کار؟

(۳) حضرت عبدالواحد بن زیدؒ کہتے ہیں: میرا گزر ایک شخص پر ہوا جو برف میں سوتا تھا، میں نے اس سے پوچھا: "کیا تجھ کو برف کی سردی نہیں لگتی؟" اُس نے کہا: "جس کو اللہ تعالی کی محبت نے سب سے بے تعلق کر دیا ہو، اس کو برف کی سردی کیا معلوم؟ ولنعم ماقیل:

گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی است
اسیرِ بندِ تو از ہر دو عالم آزاد است! (حافظ)

(۴) خواجہ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "قیامت کے روز تمام امتیں اپنے انبیاء کرام کے نام سے پکاری جائیں گی: یا امۃ موسیٰ ویا امۃ عیسیٰ "عاشقانِ جمالِ ایزدی کو اس طرح پکارا جائے گا۔

یا اولیاء اللہ ھلمّوا الی اللہ — اے خدا کے چاہنے والو چلو اپنے محبوب کی طرف۔

یہ سن کر ان کو ایسی خوشی ہوگی کہ قریب ہوگا کہ ان کے دل پھٹ جائیں اور ان کو شادیٔ مرگ ہو جائے:

من خود بچہ ارزم کہ کنم دعویٔ عشقت؟ تا جانِ منِ سوختہ مشتاقِ تو باشد!
خواہم کہ شوم کشتۂ تیغِ تو کہ ننگ است نامے کہ نہ در دفترِ عشاق تو باشد!

حضرت یحییٰ منیریؒ نے اس قول کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تھا: جملہ مومنین حق تعالیٰ کی اصل محبت میں اشتراک رکھتے ہیں کیونکہ ان کو اصل معرفت میں اشتراک حاصل ہے۔ لیکن جن لوگوں کے قلوب پر اس محبت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ عشق کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں وہ بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کیفیت کے حصول کے دو طریقے بتلائے جاتے ہیں: ایک تو دنیوی تعلقات کا قطع کرنا ہے اور غیرحق کی محبت سے دل کو خالی کرنا ہے اور دوسرے حق تعالیٰ کی معرفت کا قوی کرنا ہے اور اس کا دل پر غالب کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دل تمام شواغلِ دنیوی سے پاک ہو جائے۔

چوں دلِ تو پاک گردد از صفات تافتن گیرد ز حضرت نورِ ذات
چوں شود آں نور بر دل آشکار در دلِ تو یک طلب گردد ہزار

(۵) ہرم بن حیان فرماتے ہیں: مومن جب اپنے رب کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے اور جب اس سے محبت کرتا ہے تو اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب اس توجہ کا لطف و حلاوت پاتا ہے تو دنیا کی طرف خواہش کی نظر سے نہیں دیکھتا اور نہ آخرت کی طرف کاہلی سے دیکھتا ہے، وہ اپنے جسم کے اعتبار سے تو دنیا میں رہتا ہے لیکن اپنی روح کے اعتبار سے آخرت میں:

مارا نہ غمِ دوزخ و نے حرصِ بہشت است
بردار ز رخ پردہ کہ مشتاقِ لقائیم!

(۶) یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں: "حق تعالیٰ کے عفو سے تمام گناہ دور ہو جاتے ہیں"

تو پھر اس کی رضا کا کیا حال ہوگا؟ اس کی رضا سے سب کام پورے ہوجاتے ہیں تو پھر اس کی "محبت" کیسی ہوگی؟ اس کی محبت عقل کو مدہوش کردیتی ہے تو پھر "مودّت" کا کیا کہنا ہے؟ اس کی مودت جب ماسوا کو بھلا دیتی ہے تو پھر اس کے لطف کا کیا ٹھکانا؟

(۷) یحییٰ بن معاذؒ ہی کا قول ہے: میرے نزدیک ایک رائی کے برابر محبت ستّر برس کی اس عبادت سے بہتر ہے جو بغیر محبت کے ہو۔ اسی معنی میں کسی عارف کا شعر ہے۔

پیش حق یک نالہ از روئے نیاز
بہ کہ عمرے بے نیاز اندر نماز!

(۸) روایت کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گزر تین افراد پر ہوا جن کے جسم لاغر اور رنگ زرد ہوگئے تھے۔ آپ نے ان سے دریافت کیا: "تمہارا یہ حال کیوں ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "دوزخ کے خوف سے"۔ آپؑ نے فرمایا: "حقٌّ عَلَی اللہ ان یومن الخائف" یعنی اللہ تعالیٰ خوف کرنے والوں کو ضرور امن میں رکھے گا۔" آپ آگے چلے تو اور تین شخص نظر آئے جو لاغریٔ جسم اور زردیٔ چہرہ میں ان سے بھی زیادہ تھے، پوچھا: "تمہارا یہ حال کیسے ہوا؟" کہا: "جنت کے شوق میں" فرمایا: "حقٌّ عَلَی اللہِ اَنْ یُّعْطِیَکُمْ مَا تَرْجُوْنَ" یعنی حق تعالیٰ تمہیں ضرور وہ چیز عطا کریں گے جس کی تم امید لگائے بیٹھے ہو" آگے چل کر آپ نے اور تین مرد دیکھے جن کی لاغری اور ناتوانی حد سے زیادہ تھی، اور جن کے چہرے نور کے آئینے معلوم ہوتے تھے۔ ان سے بھی آپ نے وہی سوال کیا۔ انھوں نے کہا: "حق تعالیٰ کی محبت نے ہمارا یہ حال کردیا ہے" حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: "اَنْتُمُ الْمُقَرَّبُوْنَ، انتم المقربون، انتم المقربون! یعنی تم ہی مقربانِ بارگاہِ حق ہو، تمہیں خاصانِ درگاہِ حق ہو، تمہیں نزدیکانِ حضرتِ حق ہو!" اُن کے حال کا یہ بیان تھا۔

مارا نہ غمِ دوزخ و نے حرصِ بہشت است بردار ز رخ پردہ کہ مشتاق لقائیم!

حضرت علیسیٰؑ نے ان عاشقانِ الٰہی کو مقرب اس لیے قرار دیا کہ وہ مطلوبِ حقیقی ہی کے فدائی تھے، اور اسی کے شیدائی، حق تعالیٰ سے بہتر کون ہو سکتا ہے جس کی تمنا کی جائے اور ایک لحظہ کے لیے بھی اس سے اپنے دل کو خوش کیا جائے؟ جامی سامیؒ نے یہی بات پوچھی تھی:

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس — تا بداں دل شاد باشی یک نفس؟

من نہ شادی خواہم و نہ خرمی — ایچ نہ خواہم من از تو ہم تو ئی!

عشق و محبت کا رتبہ قرآنِ حکیم و احادیثِ صحیحہ اور اقوالِ اکابرینِ سلف کی روشنی میں معلوم کر کے صوفیائے صافیہ نے کہا ہے کہ ایمان کا شجرۂ طیبہ اسی وقت پوری طرح بار آور ہو سکتا ہے جب اس کو عشق و محبت کے آبِ حیات سے سینچا جائے ؎

ہر کہ را عشق نیست ایماں نیست (خواجہ بندہ نوازؒ)

اس قول کی بنیاد بخاری و مسلم کی وہ حدیثِ صحیح ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے "لا یومن احدکم حتی یکون اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما" اسی لیے امام غزالی نے فرمایا کہ مقاماتِ سلوک الی اللہ میں بلند ترین درجہ مقامِ محبت ہی کا ہے، اس کے سوا جو مقامات ہیں وہ یا تو مقامِ محبت کے مقدمات ہیں یا اس کے توابع و نتائج۔

"فان المحبۃ للہ ھی الغایۃ القصوی والذروۃ العلیا من الدرجات، فما بعد ادراک المحبۃ مقام الا ھو ثمرۃ من ثمارھا و تابع من توابعھا، کالشوق والانس والرضا، ولا قبل المحبۃ مقام الا ھو مقدمۃ من مقدماتھا، کالتوبۃ والصبر	"محبت الٰہی تمام مقامات کی انتہائی غایت اور بلند ترین چوٹی ہے، اس لیے کہ ادراکِ محبت کے بعد کوئی سا مقام ہو، خواہ وہ شوق ہو، یا انس یا رضا سب اسی کے توابع و ثمرات ہیں، اور محبت سے پہلے جتنے مقامات ہیں مثلاً صبر و زہد و توبہ سب ہی محبت کے

والنہ ھد وغیر ھا[1]" مقدمات ہیں[2]"

"تمام اصحابِ طریقت و اربابِ حقیقت کو اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان کی تخلیق کا اہم مطلوب و اعظم مقصود ربّ العالمین کی محبت[3] ہے" اسی لیے تمام صوفیاء کا مسلمہ اصول ہے:

"ہر کرا عشق شور انگیز نیست طریقہ بروحرام است"

یعنی جس کسی کے قلب میں حق تعالےٰ کا عشق شور انگیز پایا نہ جاتا ہو، اس پر سلوک الی اللہ کا طریقہ حرام ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ ایمان بغیر محبت کے کامل نہیں ہوتا، کیونکہ ایمان اطاعت و انقیاد کا طلب گار ہوتا ہے اور یہ بغیر تعلقِ قلب و میلِ خاطر ممکن نہیں، اسی لیے خبر دی گئی کہ:

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ جو مومن ہیں ان کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔ (پ ۲ ع ۴)

اسی لیے خاتمۃ العشاق حضرت مرزا مظہر نے فرمایا تھا:

"ہر کرا چشم در روئے خود بر زمینِ خاکساریٔ عشق نہ سودہ باشد لذّتِ شوقِ سجدہ کہ ساجد موافق حدیث بر قدمِ عُلامی نماید چہ داند؟"

یعنی جس شخص نے اپنے منہ اور اپنی آنکھوں کو عشق کی زمین پر نہ گھسا ہو وہ سجدہ کی اس لذّتِ شوق کو کیا جانے جو بمواۓ حدیث السّاجد یسجد علی قدمی اللہ (سجدہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے قدموں پر اپنا سرِ نیاز رکھتا ہے) پاتا ہے؟

ان ہی حقایق کے پیش نظر شیخ عبد الحق محدث دہلوی[4] کا یہ قول درست ہے:

---

[1] احیاء العلوم من الجزء الرابع ص ۵۸، مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ، ہندوستان۔
[2] مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم، جلد چہارم ص ۳۳۳، مطبوعہ نولکشور پریس بہ تغیرِ یسیر۔
[3] حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دیسر الاولیاء ص ۴۵۵)

"محبت حیات قلوب و غذائے ارواح اہل ایمان است در مقامات از رضا و در احوال از محبت چیزے بالاتر و فاضل تر نیست، و شخص و وقت سالک بے محبت جسد بے روح را ماند[1]"	محبت اہلِ ایمان کی حیات قلب اور غذائے روح ہے۔ مقامات سلوک الی اللہ میں رضا سے، اور احوال میں محبت سے بلند و برتر کوئی مقام یا حال نہیں، سالک کا جسم محبت کے بغیر جسد بے روح کے مانند ہے!

اہل اللہ کا اس پر اتفاق ہے: "اگر محبت نیست راہ رفتن بے حاصلی است و اگر بہ عشق راہ طے کنی واصلی" یعنی اگر سالک الی اللہ کا قلب حق تعالیٰ کی محبت سے خالی ہے تو سلوک کا حاصل کچھ نہیں اور اگر یہ راستہ عشق کے قدم سے طے ہو تو وصول الی اللہ لازمی ہے۔ وصول الی اللہ کا اقرب طریق عشق ہے۔ چنانچہ خواجہ بندہ نواز عشق کو "اقرب الطرق" قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اما اگر طالب رب درد سے افتد و بداں مشغول ماند، درون و برون او را فرا گیرد نہ در وے غضب ماند و نہ شہوت باشد و نہ حرص ماند و نہ حسد، ہر آرزو بکلی روئے بانصرام و انعدام آرد۔ از زبان خواجہ (مراد، چراغ دہلویؒ) بیتے شنیدہ ام:

عشق آمد و خانہ کرد خالی — بر داشتہ تیغ لا ابالی"[2]

خواجہؒ نے عشق کے پانچ مراتب قرار دیئے ہیں اور تمام مراتب اسلام و ایمان و احسان کی بنا عشق ہی پر رکھی ہے:

(۱) شریعت: یعنی شنیدن صفت جمالِ محبوب کہ شوق پدید آید۔

(۲) طریقت: یعنی طلب کردن محبوب و رفتن در راہ محبوب۔

(۳) حقیقت: یعنی حضور بودن دائم در حسن محبوب۔

(۴) معرفت: یعنی محو کردن مراد خود در مراد محبوب۔

[1] "مدارج النبوت" از شاہ عبد الحق دہلوی قدس اللہ سرہ، مطبوعہ نول کشور پریس — ۱۳۱۷ھ ص ۳۴۴ جلد اول

(۵) وحدت: یعنی وجود فانی خود را شکستن، ہم در ظاہر و ہم در باطن، موجود مطلق داشتن ہمیں محبوب را چوں ایں ہیچ مرتبہ تمام شود کار بہ اتمام رسد" (وجود العاشقین المعروف بہ رسالۂ عشقیہ، مشمول مجموعہ یازدہ رسائل، (انتظامی پریس حیدرآباد ۱۳۶۰ھ ص ۳)

شریعت سے لے کر طریقت تک عشق کے سہارے سلوک الی اللہ طے ہوتا ہے اور یہی طریقہ اقرب طرق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے خواجہ فرماتے ہیں:

نامرد مباد ہیچ مردے   بے درد مباد ہیچ مردے
بے درد مباد ہیچ دلے   بے وقت مباد ہیچ دردے

عارف رومیؒ نے اس موضوع میں خاص امتیاز حاصل کیا ہے۔ اپنی مثنوی میں عشق حقیقی کا انھوں نے جو غوغا بلند کیا تصوف کی دنیا میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

لہ عشق می گویم و جاں می دہم از لذت او   (جامی)

عشق کی مدح میں فرماتے ہیں:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علتہائے ما
(عشق جنون الٰہی ۱۲)
اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما
(تکبر ۱۲ — مکر و حیلہ نہانی ۱۲)
جسم خاک از عشق بر افلاک شد   کوہ در رقص آمد و چالاک شد
(خاکی — برائے قبول تجلی حق ۱۲)
عشق جان طور آمد عاشقا   طور مست و خر موسیٰ صاعقا
(موسیٰ بیہوش شد ۱۲)

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت   ہر چہ جز معشوق جملہ را بسوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند   در نگر زاں پس کہ بعد از لا چہ ماند
ماند الا اللہ، باقی جملہ رفت   شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت

عاشقی پیداست از زاری دل   نیست بیماری چو بیماری دل
(یعنے عاشقی از گریۂ دل ظاہر می شود ۱۲)

علت عاشق ز علتہا جدا است — عشق اصطرلاب اسرار خدا است
اے عشق ۱۲ — از روئے احوال آفتاب معلوم گردد ۱۲

عشق زندہ در روان و در بصر — ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر
اے حق تعالیٰ ۱۲
عشق آن بگزیں کہ جملہ انبیاء — یافتند از عشق او کار و کیا
بلندی و پاکیزگی
تو مگو مارا بداں شہ بار نیست — با کریماں کارہا دشوار نیست

غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں — عشقہائے اولین و آخریں!

در نگنجد عشق در گفت و شنید — عشق دریائیست قعرش ناپدید
شرح عشق ار من بگویم بر دوام — صد قیامت بگذرد و آں ناتمام!

یارِ جاں نثار شیخ فرید الدین عطارؒ[1] فرماتے ہیں :-

کفر کافر را و دیں دیندار را — ذرۂ دردِ دل عطار را
عشق

درد را باش اے برادر درد را — زانکہ دردِ تو ہمہ درمانِ تست
اے درد محبت را

عشق ہی کے سلسلے میں فرماتے ہیں :-

ہمہ عشق است اندریں مصحف — ہمہ وصل ست اندریں گفتار
ہمہ شوق ست اندریں صفحہ — ہمہ ذوق است اندریں طومار

---

[1] وفات ۶۲۷ھ یہ مولانائے روم کے پیر طریقت تھے، حقائق و معارف میں مولانا ان کی اقتدا کرتے تھے جیسا کہ فرمایا ہے:
گرد عطار گشت مولانا — شربت از دست شمس بود نوش
کسی اور جگہ فرماتے ہیں :-
عطار روح بود و سنائی دو چشم او — ما از پئے سنائی و عطار آمدیم (نفحات الانس جامی)

قلم از راستی بدست آور　　　بر ورق ہائے جان و دل بنگار

روز و شب وردِ خویش کن ایں را　　　تا رہد جانت از ہمہ آزار

نیک باید کہ کارفرمائی　　　ورنہ خوں خوردنِ دلت بچہ کار

عطار کے خیال کی تائید کسی عارف کے اس قول سے ہوتی ہے۔

فلو کانت الجنۃ نصیب لعارفین
بدون جمالہ ووصالہ فواویلاہ!
ولو کانت النار نصیب المشتاقین
مع جمالہ ووصالہ فواشوقاہ!!

اگر عارفین کو حق تعالےٰ کے جمال و وصال کے بغیر جنت بھی نصیب ہو تو اس پر ان کو افسوس ہوگا، اور اگر حق تعالےٰ کے جمال و وصال کے ساتھ دوزخ بھی نصیب ہو تو وہ خوش ہوں گے!

عراقی[۱] عشق کی مدح میں زمزمہ سنج ہیں:

در کوئے خرابات[۲] کسے را کہ نیاز است　　　ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است

آنجا نہ پذیرند نماز و ورع و زہد　　　آں چیز کہ آنجا بہ پذیرند نیاز است

تا مستی[۳] رندانِ خرابات بدیدم　　　دیدم بہ حقیقت کہ جز ایں کار مجاز است

اسرارِ خرابات بجز مست[۴] ندانند　　　ہشیار چہ داند کہ دراں کوئے چہ راز است

خواہی کہ درونِ حرمِ عشق خرامی　　　در میکدہ[۵] بنشیں کہ رہِ کعبہ دراز[۶] است

---

[۱] شیخ فخر الدین ابراہیم مشہور بعراقی قدس اللہ تعالیٰ سرہ صاحب کتاب "لمعات" اور صاحب دیوان ہیں آپ ہمدان میں پیدا ہوئے، ملتان آکر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ کے مرید ہو گئے۔ آپ پر عشق کا غلبہ تھا ۶۸۸ھ میں وفات پائی (نفحات الانس جامی)

[۲] خرابات لغۃً میخانہ، اصطلاح صوفیا میں مراد عالم معنی و باطن عارف کامل۔

[۳] مستی صوفیا کی اصطلاح میں عاشق کا معشوق حقیقی کے عشق میں گرفتار ہونا ہے اپنی تمام صفات کے ساتھ۔

[۴] مست اصطلاح صوفیہ میں سالک مستغرق کو کہتے ہیں۔

[۵] یہاں میکدہ سے مراد مناجات کی جگہ ہے۔

[۶] مراد ہُویّتِ محضہ سے ہے جو غیب الغیب و منقطع الاشارات ہے۔

در زلفِ بتاں تا چہ فریب است کہ پیوست — محمود پریشان سرِ زلف ایاز است

ہاں تا نہ نہی پائے دریں راہ بہ بازی — زاں رو کہ دریں راہ بسے نشیب و فراز است
(مراد از حقیقت ۱۲) (کنایہ از مجاز ۱۲)

در صومعہ[1] چوں راہ ندادند مرا دوش — رفتم بدرِ میکدہ[2] دیدم کہ فراز است
(عبادت خانہ ۱۲)

از میکدہ آواز بر آمد کہ عراقی — در باز خود در اکہ درِ میکدہ باز ست

عراقیؒ کی یہ غزل عشق کی شان میں زیادہ مشہور ہے،

سازِ طرب عشق[3] کہ داند کہ چہ ساز است — کز زخمۂ او نہ فلک اندر تگ و تاز است

آورد بیک زخمہ جہاں را ہمہ در رقص — خود جان جہاں زخمۂ ایں پردہ راز است

عالم چو صدائے است ازیں پردہ کہ داند — کیں پردہ چہ پردہ است و دریں پردہ چہ راز است

راز یست دریں پردہ اگر آں بشناسی — دانی کہ حقیقت ز چہ در بندِ مجاز است

معلوم کنی کز چہ سبب خاطرِ محمود[4] — پیوستہ پریشان ز سرِ زلف ایاز[5] است

عشق است کہ ہر دم بدگر رنگ برآید — ناز[6] است بیکے جائے دگر جائے نیاز[7] است

محتاجِ نیازِ دلِ عشاق چرا شد — حسنِ رخِ خوباں کہ ہمہ مایۂ ناز است

در صورتِ عاشق چو برآید ہمہ سوز[8] است — در کسوتِ معشوق چو آید ہمہ ساز[9] است

زاں شعلہ کہ از روئے بتاں حسن برافروخت — قسمِ دلِ عاشق ہمہ سوز است و گداز است

راہی رہِ عشق بغایت خوش و نزدیک — آں رہ کہ جز ایں است ہمہ دور و دراز است

---

[1] صومعہ، اصطلاحِ صوفیہ میں مقامِ تنزیہہ ہے۔ [2] دیکھو ص ۱۱۸ [3] ساز و طرب سے کنایہ دف و چنگ ہے یہاں شاعر کی مراد اس سے ذوق و شوق شورش مطلوب ہے۔ [4] محمود یہاں حقیقت سے استعارہ ہے۔ [5] ایاز کنایہ مجاز سے ہے۔ [6] ناز لغت میں درخت نورستہ و درخت سرو و درخت صنوبر یا بے دماغی و بے پروائی کو کہتے ہیں اور صوفیا کی اصطلاح میں معشوق حقیقی کی اس صفت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے عاشق پر ظاہراً و باطناً اپنی تجلی کرتا ہے ۱۲ [7] نیاز لغت میں حاجت کو کہتے ہیں اور اصطلاح صوفیا میں عاشق کی صفت کا نام ہے۔ [8] سوز اصطلاح صوفیا میں سوزشِ عشق و گداز قلب یادِ حق میں مراد ہے اور فنا فی اللہ سے بھی کنایہ ہے۔ [9] ساز لغتہً وہ چیز ہے جس کو بجایا جاسکتا ہے جیسے نے، چنگ وغیرہ اور اصطلاح صوفیا میں یافتِ ذاتِ حق و بقا بحق سے مراد ہے ۱۲

مغربیؒ[1] نے عشق حقیقی کا ترانہ یوں گایا ہے :

ما مہر تو دیدیم وز ذرات گذشتیم	از جملہ صفات از پئے آں ذات گذشتیم
در خلوت تاریک ریاضات کشیدیم	در واقع از سبع سموات گذشتیم
دیدیم کہ اینہا ہمہ خوابست وخیالات	مردانہ ازیں خواب وخیالات گذشتیم
با ما سخن از کشف وکرامات چہ گوئی	چو از سر کشف وکرامات گذشتیم
اے شیخ اگر جملہ کمالات تو اینست	خوش باش کزیں جملہ کمالات گذشتیم
اینہا بحقیقت ہمہ آفات طریق اند	ما در طلب از جملہ آفات گذشتیم
ما از پئے نورے کہ بود مشرق انوار	از مغربی وکوکب ومشکوٰۃ گذشتیم

فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمارا کام صرف عشق بازی ہے :

کارے بغیر عشق نداریم در جہاں
عشق ست کار ما ودریں کار آمدیم

اور اس عشق بازی میں ہم کرتے کیا ہیں ؟

منم کہ روئے ترا بے حجاب می بینم	منم کہ بے شب وروز آفتاب می بینم
منم کہ بر لب دریائے بے نہایت او را	مثال ہر دو جہاں چوں حباب می بینم
مرا بہ شیخ کتابے مکن حوالہ دگر	کہ من حقیقت خود در کتاب می بینم
چہ بادہ خوردہ دل مغربی کہ من او را	بسان نرگس مستت خراب می بینم

لسان الغیب وترجمان الاسرار حافظ شیرازیؒ[2] فرماتے ہیں :۔

---

[1] مولانا محمد شیریں مشہور بہ مغربیؒ شیخ اسمٰعیل سیسیؒ کے مرید ہیں۔ ایک اور شیخ سے جن کی نسبت شیخ محی الدین ابن عربیؒ سے ہے خرقہ پہنا۔ عشق کا ان پر غلبہ تھا۔ بادۂ وحدت وجد سے مست تھے۔ ۶۰ سال کی عمر میں ۸۰۹ھ میں وفات پائی۔ (نفحات الانس)

[2] شمس الدین محمد الحافظ الشیرازی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ لسان الغیب اور ترجمان الاسرار ہیں۔ بہت سارے غیبی اسرار کو صورت مجاز میں ظاہر فرمایا ہے۔ جامی فرماتے ہیں کہ وہ کسی شیخ کے مرید ہیں یا نہیں اور تصوف (باقی صفحہ ۱۲۱ پر)

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی! — تا راہ بیں نباشی کے راہبر شوی؟

دست از مس وجود چو مردان رہ بشوی — تا کیمیائے عشق بیابی و زر شوی!

گر نورِ عشقِ حق بدل و جانت افتد — باللہ کز آفتاب فلک خوب تر شوی

از پائے تا سرت ہمہ نور خدا شود — در راہِ ذوالجلال چو بے پا و سر شوی

بنیادِ ہستی تو چو زیر و زبر شود — در دل مدار ہیچ کہ زیر و زبر شوی

گر در سرت ہوائے وصال ست حافظا
باید کہ خاکِ درگہِ اہلِ بصر شوی!

خود اپنے عشق کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

عاشقِ یارم مرا با کفر و با ایمان چہ کار[۲] — تشنۂ دردم مرا با وصل و با ہجران چہ کار

از لبِ جانان نمی یابم نشانِ زندگی — بیس مرا اے جانِ من با جان و با جانان چہ کار

کشتۂ عشقم مرا از شحنۂ دوراں چہ غم — مفلس عورم مرا با زمرۂ دیوان چہ کار؟

چونکہ اندر ہر دو عالم یار می باید مرا — با بہشت و دوزخ و با حور و با غلمان چہ کار!

قبلہ و محرابِ من ابروئے دلدار ست بس — ای دلِ شوریدہ را با این چہ و با آن چہ کار؟

ہر کہ از خود شد تجرد در طریقِ عاشقی — از غم و درویش چہ آگاہی و با درمان چہ کار؟

صورتِ مرداں چہ خواہی ہمیشہ دلکش — مردِ عاشق پیشہ را با صورتِ الوان چہ کار؟

یعنے لباس ظاہری و نقش و نگار و محبوبان مجازی

حافظا گر عاشق ہستی دگر رہ باز گوی
عاشقِ یارم مرا با کفر و با ایمان چہ کار

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ کسی شیخ سے نسبت درست کی ہے یا نہیں لیکن ان کے اشعار میں گروہ صوفیاء کے مشرب کے موافق ایسے اشعار ملتے ہیں کہ کسی اور کے ہاں نہیں ملتے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ کوئی دیوان، دیوان حافظ سے بہتر نہیں۔ آپ کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی۔ ——

۲ اصطلاح صوفیہ میں کفر و ایمان سے مراد ظلمت و نور ہے چنانچہ مشہور ہے ست نور و ظلمت لطیف و ظہرست آمدہ و کفر و ایمان لطفند و قہرست آمدہ مغربی کا شعر ہے ہست کفر و ایمان چوں حجاب راہِ حق اندرے پسر رو بسان مغربی از کفر و ایمان در گذر

امیر خسرو[1] جنہیں عشق و محبت کی شراب سے پوری چاشنی تھی فرماتے ہیں :

ہر رگِ من تار گشتہ حاجت زنار نیست — کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست!

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب — دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن — نسبت باندکے دارد وے خونبار نیست

شاد باش اے دل کہ فردا بر سرِ بازارِ عشق — مژدۂ قتل است اگرچہ وعدۂ دیدار نیست

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند — آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

ان ہی کی ایک مشہور رباعی ہے :

از شعلۂ عشق ہر کہ افروختہ نیست — با او سرِ سوزنِ دلم دوختہ نیست

گر سوختہ نہ بسوئے من آکہ ز عشق — آتش بدلے (یعنی برابر سوزن) زنیم کہ سوختہ نیست

خسروؒ کا تعلق چشتیہ سلسلہ سے تھا۔ تصوف کے سلاسل میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے بزرگوں میں عشق کی حرارت اور جوش زیادہ نمایاں نظر آتا ہے ان کے مکاتیب و ملفوظات عشق و محبت و درد و ذوق و شوق سے بھرے ہوئے ہیں چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز چشتیؒ فرماتے ہیں :

"مشائخ ما صوفیانِ عاشق بودہ اند، شیخ شہاب الدین و اتباع ایشاں مردان بزرگ

---

[1] خسرو دہلوی کا لقب معین الدین ہے آپ کے والد قبیلۂ لاچین کے امراء میں سے تھے۔ سلطان مبارک شاہ خلجی کی وفات کے بعد خسرو نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں پہنچے، ریاضات و مجاہدات میں مصروف ہوئے، چالیس سال تک صوم الدہر رکھا، اپنے شیخ کے ہمراہ طے ارض کے طریق سے حج کیا۔ شیخ کے اشارے سے خضر علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان سے التماس کی اپنا لعاب ان کے منہ میں ڈالیں حضرؑ نے فرمایا کہ یہ دولت تو سعدی لے گئے، خسروؒ شکستہ خاطر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی تو آپ نے اپنے منہ کا لعاب ان کے منہ میں ڈال دیا۔ اس کی برکت سے ۹۹ کتابیں تصنیف کیں، اور اپنے بعض تصانیف میں خود لکھا ہے کہ میرے شعر پانچ لاکھ سے کم ہیں اور چار لاکھ سے زیادہ صاحبِ سماع و وجد و حال تھے ۷۴ برس کی عمر میں ۷۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔

عارف دو اصل بودہ اند اما عشق جہانے دگیر است ؎

بہ فراغ دل زمانے نظرے بہ خوب روے

بہ از آنکہ چتر شاہی ہمہ عمر ہائے و ہوے " (جوامع الکلم ص ۳۱)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا لقب "محبوب الٰہی" تھا۔ اپنے ایک مکتوب (بنام مولانا فخر الدین مروزی) میں تحریر فرماتے ہیں۔ (اس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے)

"اتفاق اصحاب طریقت و ارباب حقیقت است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر محبت رب العالمین است"[۱]

سیر الاولیاء میں مذکور ہے کہ حضرت محبوب الٰہی اپنے مریدوں کو تلقین فرمایا کرتے تھے:

"ہر وقت از خدائے عز و جل محبت حضرت حق می باید خواست و ایں دعا را بسیار باید خواند

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنۡ یُّحِبُّكَ وَالۡعَمَلَ الَّذِیۡ یُؤَدِّیۡ اِلٰی حُبِّكَ اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنۡ نَفۡسِیۡ وَاَھۡلِیۡ وَمِنَ الۡمَآءِ الۡبَارِدِ" (ص ۴۶۵)

حضرت مخدوم عالم خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ فرماتے ہیں:

چوں محبت شد ہمہ شد[۲]

تشنۂ او میر گر تو زندۂ خاک آں در باش گر تو بندۂ

ذرۂ دردِ خدا در دل ترا بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

حضرت چراغ دہلویؒ کے خلیفہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ تو پیدائشی عاشق تھے، آپ نے غم عشق شیر مادر کے ساتھ نوش جاں فرمایا تھا:

مادرم عشق بار زاد مرا شیرِ اندوہ و درد داد مرا (دیوان)

---

[۱] سیر الاولیاء۔ فی محبت حضرت جل و علیٰ (اردو ترجمہ از غلام احمد بریلوی) ص ۵۵۴

[۲] منقول از جواہر غیبی مصنفہ حضرت سید منظر علی شاہؒ مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ ص ۴۳۹

آپ دائماً مست عاشق ہیں، ہرگز ہوشیار ہونا نہیں چاہتے:

من مست عشقم ہشیار نخواہم شد
من خفتہ بہ معشوقم بیدار نخواہم شد

آپ کو عشق سے عشق رہا ہے اور ہمیشہ اس کی مدح وثنا میں رطب اللسان رہے،

اے محمد عشق را مدّاح باش
مدح آدمی گوہر فضلی و باب

رسالۂ وجود العاشقین[1] کے آخر میں خواجہؒ کی ایک مثنوی ملتی ہے جس میں عشق کی یوں مدح فرماتے ہیں:

عشق گوہر بے بہا و بے نشاں ۔۔۔ بہر عشق ہر دمے تو جاں فشاں
عشق اول، عشق آخر، جاوداں ۔۔۔ با خودی تو دو بنازد دائماں!
عشق نور و عشق ناز و عشق دار ۔۔۔ عشق پنج و ہفت باشد عشق چار
عشق باد، و عشق آتش و عشق خاک ۔۔۔ در حقیقت عشق باشد جانِ پاک
عشق شاہ و عشق ماہ و عشق راہ ۔۔۔ بر سرِ خود عشق پوشد صد کلاہ
عشق عرش و عشق کرسی، راز داں ۔۔۔ ہم قلم، ہم لوح، ہم محفوظ داں
عشق شمس و ہم سمار و ہم زمیں ۔۔۔ ہم فرشتہ در شمارے در مکیں
عشق روشن ہم نجوم و ہم بروج ۔۔۔ با خودی خود نزول و ہم عروج
عشق بیخ و عشق شاخ و عشق گل ۔۔۔ عشق میوہ، عشق تخم، و عشق کل
عشق در صورت جمال خود نمود ۔۔۔ جملہ اشیاء در حقیقت عشق بود

سلسلۂ چشتیہ کے ایک فرد فرید حضرت سید عبد الستارؒ خلیفۂ شاہ پیر محمد سلونیؒ کا اصرار رہا ہے:

---

[1] وجود العاشقین ص ۱۱

"بہر طورے کہ باشد درد حاصل کند"
[۱]
دردرا در ہندومی گویند پیر"

می تواں بے دردرا بے پیر گفت

حضرت شاہ تراب علی قلندر[۱] رحؒ جو شراب عشق الہیٰ سے سرشار نظر آتے ہیں، عشق و محبت کی مدح میں فرماتے ہیں :

از محبت چوں جہاں راشد نظام — کارہائے عشق کے گردد تمام
شد محبت رانظہور اعتدال — بے محبت کے شود پیدا کمال
ہر دلے راکز محبت شور نیست — ز آفتاب عشق او را نور نیست
ہر کہ با عشق و محبت آشناست — محرم در گاہ خاص کبریاست
در طریق عاشقاں برتر مقام — از محبت نیست برتر والسلام
کے محبت بے نقاب آید بروں — می کند افسون عالم را فسوں
گر ز نور عشق تا بد یک شرر — از تف او خلق را سوز و جگر! [۲]
جاں کہ از نور محبت باصفا است — او بہ بزم وصل جاناں آشناست
ہر کہ شد جویائے وصل از خاص و عام — بے محبت نیست کار او تمام
از محبت گشت ظاہر ہر چہ ہست — وز محبت می نماید نیست ہست
گر علم بیروں زند سلطان عشق — ملک جانہا می شود ویران عشق
شد محبت روح و عالم ہمچو تن — گر نباشد جاں چہ کار آید بدن
چونکہ دارد عشق ہر جائے ظہور — میل ہر سوے اگر باشد چہ دور

[۱] اے درد عشق ۱۲

[۲] سحر و عزیمت ۱۲

[۱] شاہ تراب علی قلندرؒ خلف اکبر و خلیفہ جانشین حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۵ھ میں وفات پائی جملہ طرق سلاسل سبعہ از طریق قلندری میں خلافت دادہ و مجاز کردہ تھے۔ ابتدائے حال سے مرتبہ کمال تک ان پر کشش عشق و جذبہ محبت غالب تھا۔

دل بہر سوئے کہ مائل می شود — او بسوئے دوست آں سو می رود

ہیچ طالب را جز او مطلوب نیست — در دو عالم غیر او محبوب نیست

غرقِ دریائے محبت گر شوی — از کمالِ عشق رمزے بشنوی

ہر چہ دارد ایں جہاں بود و نمود — از طفیلِ عشق آمد در وجود

شد علاماتِ محبت در جہاں — ترکِ کبر و ہستی و سود و زیاں

صورتِ معشوق و عاشق را یقیں — آئینہ حسن و جمالِ عشق بیں

عشق آمد رابطہ اندر جہاں — آئینہ معشوق و عاشق عشق داں

حسنِ او بے عشقِ او نبود تمام — کے نماید بے گدا جود کرام (جود: سخاوت ۱۲، کرام: بزرگاں ۱۲)

نازِ معشوقاں ہمی گردد عیاں — از نیازِ عاشقانِ جاں فشاں

گر نیازِ عاشقِ دیوانہ نیست — نازِ معشوقی کہ می داند کہ چیست

سنگِ خارا از محبت نرم شد — آنچو یخ افسردہ از دمی گرم شد (یخ: برف)

ایں محبت شاہ را سازد گدا — می کند او ہر گدا را بادشاہ

ہر کسے کو از محبت نور یافت — از غم و شادی بکلی رو بتافت

بے محبت وصلِ جاناں را نیافت — اندریں رہ سالہا ہر کو شتافت

از محبت مردہ زندہ می شود — وز محبت شاہ بندہ می شود

اپنا حالِ زار بیان فرماتے ہیں:

خوردم از تیرِ نگہ پیکانِ عشق — کرد تیغِ ابروش قربانِ عشق

واعظا از حالم ترا نبود خبر! — از برم برخیز اے نادانِ عشق

ہر چہ بادا باد، من سر دادہ ام — در رہِ سلطانِ عالی شانِ عشق

فارغم کردہ است از ناموس و ننگ — ہست بر من ایں قدر احسانِ عشق (ناموس و ننگ: اے جہاں عزت و شرم ۱۲)

کیست محرم، تا بگویم حالِ خود — بادشاہِ وقتم از فیضانِ عشق

تا یکے طال اللسان باشی تراب
لب بہ بند، و تن بزن برائے جانِ عشق
(خاموش رہ ۱۲)

لہذا سالک کو چاہیے:

آتشِ دردِ طلب[1] در دل فروز   ہر چہ یابی مطلوبت بہ سوز
بگذر از ناموس در راہِ طلب (خیال عزت خود ۱۲)   لاابالی وار رو در راہ رب (بے پرواہ ۱۲)
ہر کہ در راہِ طلب مردانہ است   از خیالِ کفر و دیں بیگانہ است
تا طلب در باطنت ظاہر شد   در بلائے (یعنی کلفت و رنج) عشق جاں صابر شد
آں دلے کو ہست خالی از طلب   دائماً با دا پُر از رنج و تعب!
آں سرے کو را ہوائے دوست نیست   زد مجو مغزے کہ او جز پوست نیست
جاں ندارد ہر کہ جویائے تو نیست   دل ندارد ہر کہ شیدائے تو نیست
روح کو روح خیالت را نیافت   چند خواں چوں نور حق بروے نتافت
ہر کہ او جویائے اسرار تو نیست   کور بہ، چوں درخور (لائق ۱۲) دیدار تو نیست
سینۂ کز عشق بروے نیست داغ   ز آتشِ دوزخ مبادا او فراغ (فراغت ۱۲)
گوش کو گفتارِ جاناں نشنود   گر شود کر عاقبت بہتر شود
ہر مشامے کو ندارد مہرِ دوست   او بریدہ بہ ز تیغ قہرِ دوست
ہر کہ طالب نیست انسانش مخواں   زانکہ دارد صورت اما نیست جاں
در رہِ عشقش گذر از گفتگو   جستجو کن، جستجو کن، جستجو
در طریقِ جستجوئے وصلِ یار   دین و دنیا کردہ باشد آں نثار
طالبش آنکہ بوصلش رہ برد   کہ سوئے دنیا و عقبیٰ ننگرد!!

---

[1] طلب کے لغوی معنی ڈھونڈھنے کے ہیں صوفیہ کی اصطلاح میں حق تعالےٰ کی تلاش کو طلب کہتے ہیں، راہ عبدیت وعبودیت سے عام طور پر یہ تلاش کی جاتی ہے۔

شاہ نراب فرمایا کرتے تھے:

"آنجا و اینجا جز دوستی چیزے دیگرے طالب نیست۔ ہر کرا محبت نیست ادب نیست۔ زہد و پارسائی صرف آنجا درکار نیست، و بدتر از زہد خشک فی الحقیقت آزار نیست"
تکلیف ۱۲

اور اسی معنی میں کسی کا قول ہے:

حلقۂ توبہ گر امروز چو زہاد زنیم ۔۔۔ خازنِ می کدہ فردا نکند در بازم!

آخر میں ہم جامی[1] سامیؒ کے جذبات کو پیش کرتے ہیں۔ سیر و سلوک عشق کے بغیر میسر نہیں ہوتا، جو لوگ نماز و روزہ ہی سے خوش رہے وہ مقامات و علوئے درجات سے بے خبر رہے۔ جامی زمزمہ سنج ہیں:-

ہزاراں عاقل و فرزانہ رفتند ۔۔۔ ولے از عاشقی بیگانہ رفتند
اسیرِ عشق شو کآزاد باشی ۔۔۔ غمش بر سینہ نہ تا شاد باشی!
زبادِ عشق عاشق تازگی یافت ۔۔۔ ز ذکرِ او بلند آوازگی یافت
اگر مجنوں نہ مے زیں جام خوردے ۔۔۔ کہ اورا در دو عالم نام بردے
مئے عشقت دہد گرمی و مستی ۔۔۔ دگر افسردگی و خود پرستی!
متاب از عشق رو گرچہ مجازیست ۔۔۔ کہ آں بہرِ حقیقت کارسازیست
دلے فارغ ز دردِ عشق دل نیست ۔۔۔ تنے بے دردِ دل جز آب و گل نیست
غمِ عشق از دلِ کس کم مبادا ۔۔۔ دلِ بے عشق در عالم مبادا!

[1] اصل لقب عماد الدین مشہور بلقب نور الدین، عبد الرحمٰن جامی، عالم عارف و عامل کامل مقتدائے ما وراء النہر و شیخ خراسان، پیشوائے زمان رہے ہیں۔ مولانا سعد الدین کاشغریؒ کے مریدانِ کامل میں سے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا تھا "شاہ بازے بچنگال افتادہ است" خواجہ عبید اللہ احرارؒ کو جامیؒ سے بہت محبت تھی۔ جامیؒ کی تصانیف (۴۴) ہیں۔ شواہد النبوۃ اور نفحات الانس ان تصنیفات میں بمنزلہ دو چشم ہیں، ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ہرات میں اپنے مرشد کی قبر کے متصل سپرد خاک کئے گئے۔ سنہ وفات ۸۹۸ھ ۱۸ محرم روز جمعہ وقت اذان (سفینۃ الاولیاء ص ۸۳-۸۴)

آپ پر ابتدائے حال سے مرتبۂ کمال تک کششِ عشق و جذبۂ محبت غالب رہا، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

لذتِ عشق فرو رفت مرا در رگ و پے
عشق می گویم و جاں می دہم از لذتِ وے

فرماتے ہیں کہ عشقِ الٰہی کے بعد سوائے طلبِ الٰہی کے نہ کوئی خواہش باقی رہتی ہے اور نہ مراد:

با عشق تو ام ہوا نماند ست و ہوس | با آتشِ سوزندہ چساں ماند خس
خواہد ز تو مقصودِ دلِ خود ہمہ کس | جامی از تو ہمیں خواہد و بس

ہست مراد ہر کسے چیزِ دگر ازیں جہاں | نیست مراد غیرِ تو جامیِ نامراد را

اواخر حال میں جب مرتبۂ کمال کو پہنچ گئے تو فرمایا:

خوش وقتِ کسے کہ مے در خمخانہ | از خم بسبو کشد نہ از پیمانہ
صد بار اگر نیست شود عالمِ ہست | واقف نشود کہ ہست عالم یا نہ

یہ فنا فی اللہ کے حال کی تعبیر ہے۔ جب بندہ نہیں رہتا، وہ فنا ہو جاتا ہے تو صرف حق تعالےٰ ہی باقی رہتے ہیں!

رفت او ز میاں ہمی خدا ماند خدا
الفقر اذا تم ھو اللہ این است (جامی)

اب یہاں ہم "مقامِ عشق" پر اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔ اس مسئلہ سے اہلِ کمال کے دفاتر بھرے ہوئے ہیں، کہاں تک طول دیا جائے؟

من شاء الاطلاع علیہ کما ھی فلیراجع علی اسفار
ھؤلاء الکبار اولی الایدی والابصار

باب (۴)

عشق اور صوفیہ وجودیہ

اکابر صوفیا سے ایک حدیث قدسی کی روایت کی جاتی ہے جس کو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے بھی بیان کیا ہے اور اہلِ کشف اس کی صحت کے قائل ہیں اور وہ یہ ہے:

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ	میں ایک گنج مخفی تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں،
فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ	پس میں نے خلق کو پیدا کیا تاکہ پہچانا جاؤں۔

اس حدیث کو حافظ سخاویؒ نے بعض الفاظ کی کمی دبیشی کے ساتھ "مقاصدِ حسنہ" میں نقل کیا ہے اور علامہ محدث محمد بن ابراہیمؒ نے فرمایا: "یہ حدیث صوفیہ سے مروی ہے جس شخص نے قرآنِ حکیم کی اس آیت پر غور و تفکر کیا ہے اس کو اس حدیث کی صحتِ معنوی کا علم حاصل ہو سکتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ	اللہ ایسا ہے جس نے سات آسمان پیدا
الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ	کیے اور ان ہی کی طرح زمین بھی، ان سب میں
بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ	احکام نازل ہوتے رہتے ہیں تاکہ تم کو معلوم
شَیْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ	ہو جائے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور اللہ ہر
بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا. (پ ۲۸ ع ۱۸)	شے کو احاطۂ علمی میں لیے ہوئے ہے۔

اور ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث قدسی کے معنے حق تعالےٰ کے اس قول کے مطابق ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (پ ۲۷ ع ۲) اور میں نے جن و انس کو اس واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

لیعبدون ای لیعرفون، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے تفسیر فرمائی ہے۔

صوفیہ نے اس حدیث کی توضیح یوں کی ہے: ذات حق سبحانہ تعالیٰ گنج مخفی ہے، یعنی باعتبار عدم معرفت وہ غیب الغیب ہے، اس کی کنہ سے سوائے اس کے کوئی واقف نہیں، اسی ذات نے اپنے جمال و کمال کو خارج میں ملاحظہ فرمانے کے لیے باطن سے ظاہر میں اپنے صُوَرِ علمیہ یا باصطلاح صوفیہ "اعیانِ ثابتہ" کے آئینوں کو آراستہ کیا جو صورتیں کہ باطن میں (یعنی باصطلاح صوفیہ "واحدیت" میں) ثابت تھیں جس کی وہ ذات علماً شاہد تھی، خارج میں یا مرتبۂ عین میں ان کو خود اپنے ظہور سے نمودار کیا اور عیناً یا خارجاً بھی خود اپنی آپ شاہد ہوئی۔ ہو الشاہد و ہو المشہود! اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے۔

کسی عارف نے اس حدیث قدسی کی ان پاکیزہ اشعار میں یوں توضیح کی ہے:

از محبت گشت ظاہر ہر چہ ہست ۔۔۔ واز محبت می نماید نیست ہست

نازِ معشوقی تقاضائے نیاز ۔۔۔ کرد پیدا، تا نماید جملہ راز

از نیازِ ماست نازِ او عیاں ۔۔۔ می کند اَحْبَبْتُ ایں معنی بیاں

آنکہ معشوق ست از وجہِ دگر ۔۔۔ عاشقش می گو، اگر داری خبر!

کسی اور عاشق عارف نے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس راز کو یوں عیاں کر دیا ہے[1]

---

[1] چہرۂ منیر نبوی، از حاجی احمد علی صاحب، مطبع عطاء الرحمٰن، مدراس ۱۳۱۵ھ ص ۱۸۴۔

خدا بود عاشق بخود اے گدا ۔۔۔ جہاں کردہ آئینہ خود رہ نما
تماشائے خود را بخود می نمود ۔۔۔ کہ خود عاشق و عشق معشوق بود

میر سید حیاتؒ نے اس کو یوں ادا کیا ہے[1]۔

آپ طالب و آپ مطلوب ہے
خود محب ہے خود اپنے محبوب ہے

عارف رومیؒ نے اپنے طریقہ سے اس راز کا اس طرح افشا کیا ہے:

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ
زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

یعنی ذات حق ہی کا صرف وجود ہے، وہی عاشق ہے اور وہی معشوق، ماسوائے حق غیر موجود یا معدوم ہے یا محض اعتباری ہے! شیخ فخر الدین عراقیؒ نے عشق سے اشارہ ذات احدیت مطلق کی طرف سمجھا ہے، فرماتے ہیں:

در عشق سرِ زباں گزیدہ است ۔۔۔ رازش ہمہ با سر بریدہ است
در عشق مجوئے ما و من را ۔۔۔ صد بار بگفتم ایں سخن را

وہ راز اور وہ سخن بس یہی ہے، العشق ھو اللہ!

اور خواجہ شمس الدین احمد علی مصنف "اصطلاحاتِ صوفیہ" کا دعویٰ ہے کہ یہی خیال تمام متاخرین کا بھی رہا ہے[2]۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی طرف ایک رسالہ منسوب کیا جاتا ہے جس کا نام "رسالۂ توحیدیہ" ہے آخر رسالہ میں آپ فرماتے ہیں:

---

[1] مصباح الحیات از مولانا میر محمد حیاتؒ، فتح الکریم پریس، بمبئی، ۱۳۰۶ھ۔

[2] دیکھو ان کی کتاب "اصطلاحات صوفیہ" ص ۳۰ تحت توضیح اصطلاح "عشق" یہ کتاب مطبع نامی لکھنؤ میں چھپی ۱۳۲۲ھ عراقی کے اشعار بھی انھوں نے پیش کیے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً فَاَحبَبتُ اَن اُعرَفَ فَخَلَقتُ الخَلقَ لِاُعرَفَ،
چوں سلطانِ عشق خواست کہ پردہ از جمال روئے خود بردارد در جمیع صفات خود پیدا آورد و با خود عشقبازی بازدو با چیزے نہ پردازد ابعدہ آں کہ نور ذات بود ازاں نورنیمے خورشید، کثیف شد، نار گشت، وچوں آتش را کثافت رسید ہوا شد، وچوں ہوا را کثافت رسید باد شد، وچوں باد راکثافت رسید آب شد وچوں آب را کثافت رسید کف غلیظ شد واز کف کثیف خاک شد، ازاں خاک مظہرہا آفرید، آں کہ نورنیمے از نور ذات باقی ماندہ بود آں نیم نور در مظہرہائے سفلی درآمد وتجلیات جمال روئے خود را در مظہرہا دیدن خواست تا بغیر مرات نتوانست دید، پس آدم و عالم را آئینہ خود ساخت، ہمچنیں صفت عاشق ومعشوق ظاہر شد وپوشیدہ نماند!

پوشیدہ بغیب چند مانم اظہار می کنم از نہانم
با جملہ صفات خویش ہر دم عیش وشوق و ذوق رانم

چوں آدم را فرستادیم بروں جمالِ خویش در صحرا نہادیم

اکنوں بداں کہ بیان عشق وعاشق ومعشوق می کنم کہ عشق چیست وعاشق ومعشوق کیست ؟
مراد از عاشق ذات محض است .... ومراد از عشق وجودِ اعیان ثابتہ ومراد از معشوق وجود اضافی است[۱]"

اس عبارتِ گہر بار کی توضیح میں کہا جا سکتا ہے کہ جب صوفیۂ وجودیہ کے نزدیک غیر کا وجود حقیقی نہیں کیونکہ حضرت حقیقۃ الحقائق کا نہ کوئی مثل ہے نہ کوئی ضد نہ کوئی ند تو ظاہر ہے کہ اس کو عشق اور محبت بھی اپنے ہی ساتھ ہوگی نہ کسی غیر کے ساتھ۔ یہی مفہوم ہے۔ اس جملہ کا کہ "با خود عشق بازی بازدو با غیرے نہ پردازد" یعنی اپنے ذات ہی سے اس کو عشق ہے غیر سے نہیں"

[۱] رسالۂ توحیدیہ از حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ ص ۴ و ۵ مطبوعہ احتشامیہ، مراد آباد ۱۸۹۱؁ طباعت ناقص پر از اغلاط۔

تکوینِ عالم کے سلسلہ میں جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے ان پر بحث غیر ضروری ہے۔ کیونکہ یہ امور یقینی تو ہیں نہیں، نہ قرآنِ حکیم اور نہ احادیثِ صحیحہ سے ان کی تائید ہوتی ہے، اور باقی نصف نور کا مظاہر میں بحیثیت ارواح داخل ہونا بھی متفق علیہ نہیں ہے۔

صوفیائے کرام کے کشف سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے: حضرت حقیقۃ الحقائق یا ذاتِ خداوندی نے اپنے اسمار کے کمال کو ایسی جامع مخلوق میں مشاہدہ کرنا چاہا جو اس کے کمالات کی نمائش کیلئے کافی ہو کیونکہ اپنی ذات کے کمالات کو اپنی ہی ذات میں مشاہدہ کرنا¹ اس مشاہدہ کے مانند نہیں ہوتا جو ان کمالات کو اعیانِ ثابتہ کے آئینوں میں دیکھنا² اس لیے ان اعیان کے آئینوں میں اس نے اپنے حسن و جمال کو ظاہر فرمایا اور یہیں سے فتنۂ عشق و عاشقی کا ظہور ہوا۔ جیسا کہ جامیؒ سائیؒ نے کہا ہے:

نیست با ہست عشق در پیوست — نیست زاں عشق نقشِ ہستی بست
نیست چوں فیضِ نورِ ہستی یافت — روئے ہمت بہ منبعِ او تافت
سایہ و آفتاب را باہم — نسبتِ جذبِ عشق شد محکم

یعنی اعیانِ ثابتہ یا صُوَرِ علمیہ پر جب نورِ وجود کا فیضان ہوا تو یہ عالم وجود میں آیا اور اس عالم کا جو بمنزلۂ سایہ ہے، آفتابِ وجود سے عشق کا جذبہ مستحکم ہوا۔ اس طرح عشق و عاشقی کا فتنہ پیدا ہوا۔

حضرت محبوبِ الٰہیؒ عاشق، ذاتِ حق کو قرار دیتے ہیں، کیونکہ وہی مجالیٔ اعیان میں اپنے ہی حسن و جمال و کمال کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ اپنے جمال و کمال کی [آئینہ ہا] خود ہی عاشق ہے۔ چونکہ یہ جمال و کمال تعیّنات میں ظاہر ہو رہے ہیں اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعیُّنات یا اعیانِ خارجیہ معشوق ہیں، اور چونکہ اعیانِ ثابتہ یا صُوَرِ علمیہ کا ظہور

---

¹ اس کو صوفیہ کمالِ ذاتی سے تعبیر کرتے ہیں۔
² اس کو "کمالِ اسمائی" سے تعبیر کرتے ہیں، یا ایک کو جلا دوسرے کو استجلار کہتے ہیں۔

محبت ہی کی وجہ سے ہوا ہے (فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ) کہا جا سکتا ہے کہ اعیانِ ثابتہ کی تعبیر عشق سے کی جا سکتی ہے۔ فافہم وتدبر۔

حضرت عین القضاۃ ہمدانی[1] قدس سرہ نے یہ بات اور صاف طور پر کہدی ہے

"حق تعالیٰ خود بر خود عاشق است ے

بر نقشِ خود است فتنۂ نقاش | کس نیست درمیان تو خوش باش

محققے راست:

معشوق خود است عاشقِ خویش | درعشق سخن نرفت ازیں بیش!"[2]

اسی معنی میں کسی عارف کا شعر ہے:

عاشقِ حسن خود است آں بے نظیر | حسن خود را خود تماشا می کند

کسی اور نے کہا ہے:

عشق عاشق ہے عشق ہے معشوق | خود کے اوپر خود فدا ہے عشق

شیخ نظامی گنجوی[3] نے پوری قوت کے ساتھ کہا تھا:۔

---

[1] آپ کا نام وکنیت ابوالفضائل عبدالرحمٰن بن محمد المیانجی ہے اور لقب عین القضاۃ، وطن ہمدان، آپ امام احمد غزالیؒ اور شیخ محمد بن حمویہؒ کے ہم صحبت تھے۔ خوارق وکرامات عجیبہ مثل احیاء واماتت آپ سے بہ کثرت ظہور میں آئے۔ اور آپ کے فضائل وکمالات آپ کی عربی وفارسی کی تصنیفات سے ظاہر ہیں، وفات ۵۳۳ھ میں پائی۔

[2] منقول از شمائل الاتقیاء، تصنیف شیخ رکن الدین بن عماد الدین دبیر کاشانی خلد آبادی ص ۳۲۹ و ص ۳۳۰ مطبوعہ اشرف پریس حیدرآباد دکن ۱۳۴۷ھ

[3] آپ کا مولد گنجہ ہے، علوم ظاہری وباطنی کے عالم تھے، اخی فرخ ریحانیؒ کے مرید تھے، اپنی عمر گرانمایہ اول سے آخر تک قناعت، تقویٰ وعزلت میں گزار دی، صاحب کشف وکرامات تھے، سلاطین وقت کی ملاقات سے مجتنب رہے، سلاطین خود ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ شیخ کو سخن پر قدرت کامل حاصل تھی اور آپ کے اشعار تمام کشف حقیقت وبیان معارف ہیں آپ کا انتقال ۵۹۶ھ میں ہوا۔ سفینۃ الاولیاء ص ۱۷۵، وص ۱۷۶

اللہ طلبی رد برہ عشق نظامی   العشق ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ

اسی جذبہ میں کسی نے کہا ہے:[1]

عشق ہے عشق ہے، جہاں دیکھو   سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے   یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

یعنی عاشق و معشوق ایک ہی ھوالشاھد وھوالمشھود، یعنی وہی عاشق ہے معشوق بقول قرب[2] ؎

کہیں عاشق کہیں معشوق کہیں صورت عشق
ایک ہی نور ہے سو رنگ سے مشہور ہوا

شیخ فریدالدین عطارؒ نے بھی کہا تھا: عشق آمد، کنت کنزاً شد عیاں۔ نی کند عشق این سخن بارابیاں۔ با تو گویم سر اسرار نہاں۔ اے برادر نقش را نقاش داں۔

حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ کے نزدیک،

عشق اول عشق آخر عشق ظاہر اور بطون
عشق ہی سے تو بنا ہے سر درو دیوار ہے

حضرت مسعود بک چشتی نظامی "رواتح" سے نقل فرماتے ہیں: "اے عزیز عشق صیاد خود است صید خود است، دام خود است! قید خود است مرغ خود است، دانہ خود است، شمع خود است، سوز خود است، ساز خود است، ناز خود است، نیاز خود است، آئینہ خود است، جمال خود است، عین خود است، خیال خود است، بینائی خود است، زیبائی خود است، بند خود است، رہائی خود است، لیلیٰ خود است، مجنوں خود است، فتنہ خود است، مفتون خود است، شاہد خود است، مشہود خود است، ساجد خود است، مسجود خود است، طالب خود است، مطلوب خود است، قاصد خود است، مقصود خود است ــ چہ کمالِ ذات

---

[1] چشمۂ فیض نبوی ص ۲۴۲ [2] ایضاً ص ۱۰۴

آنست کہ مجموعِ صفات خود باشد، زیرا کہ عشق ملک وجود بے انباز دارد و با وحدت خود سازد وحدہٗ لا شریک را با وجود غیر نہ پردازد، و جز با عدم نہ سازد کہ وجود با خود مشارکت ذات و مشارکت مخالفت بار و مخالفت بعداوت کشد و عداوت ضدِ محبت باشد۔" (نکات العاشقین از مولانا مسعود بک چشتی نظامی، مطبوعہ ابو العلائی پریس، حیدرآباد دکن ۱۳۱۶ھ، ص ۵۲)

جامیؒ سامیؒ صوفیہ کی اصطلاحات کی زبان میں اس "رمزِ عاشق و معشوق" کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

عشق مفتاحِ مخزنِ جود است　　ہر چہ بینی بہ عشق موجود است
ہیچ جزئے ز سافل و عالی　　نیست از عشق و حکم او خالی
حق بر خویشتن تجلی کرد　　یافت خود را دراں تجلی فرد
دید ذاتے بوصفہائے کمال　　متصف در حریمِ عز و جلال
وصفہائے ہمیشہ لازمِ ذات　　کسب کردہ ز دی بقا و ثبات
ہر چہ دارد ز نامِ غیر نشاں　　نیست دخلش در اتصافِ بآں
چوں وجوب و وجود و قدس و قدم　　بے نیازی ز عالم و آدم!
زانکہ دارد ز علم و دانش کام　　نہد آں را کمالِ ذاتی نام
لیک در ضمنِ آں کمال دگر　　دید موقوف بر ظہورِ اثر
پیشِ اہلِ شعور و دانائے　　لقب آں کمال اسمائی،
دال ظہورِ حق است در اطوار　　مختلف در خصائص و آثار
پس ظہور و تصورات ظہور　　کش بآنہا بود شعور و حضور
دیں ظہور و شہود را دانا　　می شمارد جلا و استجلا
حق چو حسنِ کمالِ اسما دید　　آنچنانش نہفتہ نہ پسندید
خواست اظہار آں کمال کند　　عرضِ آں حسن و آں جمال کند

خواست تا در مجالیٔ اعیان ‏ ‏ ‏ ‏ سرِّ مستورِ او رسد بمیان!!

چوں ز حق یافت انبعاث (انگیختہ) ایں خواست ‏ ‏ ‏ ‏ فتنۂ عشق و عاشقی برخاست

نیست با ہست عشق (تحریک) در پیوست ‏ ‏ ‏ ‏ نیست زاں عشق نقشِ ہستی بست

نیست چوں فیضِ نورِ ہستی یافت ‏ ‏ ‏ ‏ روے ہمت در منبعِ او تافت

سایہ و آفتاب را با ہم ‏ ‏ ‏ ‏ نسبتِ جذبِ عشق شد محکم

جامیؒ کے اس بیان کی ہم یہاں کچھ توضیح کریں گے اور صوفیۂ وجودیہ کے نظریۂ تخلیق کو اس کے بعد پیش کریں گے تاکہ عقلی طور پر ان کے کشف کا کچھ حال سمجھ میں آسکے۔

جامیؒ فرماتے ہیں، عشق ہی کی وجہ سے عالم کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات کو تمام صفاتِ کمالیہ ایجابیہ سے موصوف پایا۔ یہ صفات ان کی ذات کو لازم ہیں، کسی غیر کا یہاں نام و نشان بھی نہ تھا۔ صفاتِ کمالیہ جیسے وجود، وجوب، پاکی، قدامت، غنائے مطلق وغیرہ حق تعالیٰ ہی کی ذات سے مختص ہیں۔ صوفیہ نے اس کا نام "کمالِ ذاتی" رکھا ہے، یا یوں سمجھو عشق یا محبت جمیلِ حقیقی کا اپنے ہی جمال کی طرف میلان کا نام ہے (خواہ وہ مرتبہ جمع میں ہو یا مرتبہ تفصیل میں) یہاں ہم شہودِ جمالِ ذات اپنی ہی ذات کے آئینہ میں جو ہوتا ہے اس کا ذکر کر رہے ہیں جس کو کمالِ ذاتی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ کو کسی عارف نے ایک رباعی میں ادا کیا ہے:

معشوق کہ کس سرِّ جمالش نشناخت ‏ ‏ ‏ ‏ در ملکِ ازل لوائے خوبی افراخت

نے طاس سپہر بود نے مہرۂ مہر ‏ ‏ ‏ ‏ ہم خود بخود ایں نردِ محبت باخت

یعنی حق تعالیٰ نے اپنی ذات کے کمالات کو جانا اور ان کو اچھا سمجھا اور ان سے محبت کی، یہ وہ مرتبہ ہے جب حق تعالیٰ کے سوا غیر کا نام و نشان نہ تھا نہ آسمان تھا نہ سورج، كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْءٌ!

"کمالِ اسمائی" کے اظہار کے لیے حق تعالیٰ نے چاہا اپنے جمال و کمال کا خارج میں مشاہدہ کرے اس لیے عالم کو ایجاد کیا، یعنی خود صورِ علمیہ یا اعیانِ ثابتہ کی صورتوں میں ظاہر ہوئے۔ خارج کے لفظ سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عالم ذاتِ حق سے خارج ہے، ایسا نہیں، اس سے مراد ذاتِ مطلق کا تعین و تشخص ہے، عالم بالقوہ سے بالفعل ہونے میں ذاتِ حق سے خارج نہیں ہوتا، ذاتِ حق میں کوئی خلو نہیں پیدا ہوتا، ذات الآن کما کان رہتی ہے۔ ذات کی وہ تجلی جس کی وجہ سے وجود کا پرتو اعیانِ ثابتہ پر پڑتا ہے صوفیا کی اصطلاح میں کمالِ اسمائی کہلاتا ہے اس کے کئی اور نام ہیں، مثلاً فیضِ مقدس تجلی اسمائی نفس رحمانی۔ اس بیان کا خلاصہ کسی عارف کی زبان میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

آئینہ ساخت عالم را خود بخود نمود — عکس و جمالِ اوست نہان و عیاں کہ ہست

چوں حسن او بنقش جہاں کرد جلوہ — ظاہر نمود ایں ہمہ کون و مکاں کہ ہست

کو نام و کو نشان ز غیر و کجاست غیر؟ — یار است ظاہر از ہمہ نام و نشاں کہ ہست

کمالِ اسمائی کے مفہوم کو کسی عارف نے نہایت خوبی کے ساتھ ایک رباعی میں بھی ادا کیا ہے:

جاناں کہ دم عشق زند با ہمہ کس — کس را نرسد بدامنش دستِ ہوس

مرآتِ شہود او ست ذراتِ وجود — با صورتِ خود عشق ہمی باز د و بس

عوام جمالِ مطلق کے عکس کو اشیاء کے آئینوں میں مشاہدہ کرتے ہیں، اسرِ حقیقی کی انہیں خبر نہیں ہوتی اور جمالِ مقید حادث کو اپنا مقصود و مطلوب و محبوب جانتے ہیں، اس کی لذتِ وصال سے خوش ہوتے ہیں اور محنتِ فراق سے دردمند! اس مفہوم کو کس خوبی سے اس رباعی میں ادا کیا گیا ہے:

اے حسن تو کردہ جلوہ ہا در پردہ! — صد عاشق و معشوق پدید آوردہ!

از حسنِ تو لیلیٰ دلِ مجنوں بردہ!   در شوقِ تو وامق غمِ عذرا خوردہ!

نامِ عاشق ۱۲ نامِ معشوق ۱۲

صوفیہ کو اس بات کا حق الیقین حاصل ہوگیا ہے کہ مراتب وجود کے ہر مرتبہ میں حق تعالیٰ ہی اپنے آپ کو دوست رکھتا ہے اور اپنے آپ ہی سے محبت کرتا ہے، مثلاً جب کوئی صاحبِ جمال آئینہ کو پسند کرتا ہے تو اس سے اس کا مقصود اپنے ہی جمال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر مرتبہ میں حق تعالیٰ اپنی ہی ذات کا عاشق ہے، عاشق وہ خود ہے اور معشوق بھی وہ خود ہی ہے!

یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ چہ اقرار است
بزیرِ پردہ مگر خویش را خریدار است

خواجہ عطارؒ فرماتے ہیں، اور ذرا کھول کر فرماتے ہیں:۔

بجز دمی باز از خود عشق با خود
خیالِ آب و گل در رہ بہانہ ست!

اولیائے رحمٰن اپنے مجاہدوں اور ریاضتوں سے افعال و آثار کے حجابوں اور شئون و صفات کے پردوں کو چاک کر کے ذاتِ متعالیٰ حق سے واصل ہو جاتے ہیں، ان کا مرجع و مآب صرف ذاتِ حق ہی ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو کسی عارف نے یوں ادا کیا ہے:

بیروں ز حدود کائنات است دلم   برتر ز احاطۂ جہات است دلم
فارغ از صقالۂ صفات است دلم   مرآتِ تجلیاتِ ذات است دلم

جامیؒ کا بھی یہی کشف ہے، حق تعالیٰ کے مراتب وجود میں وہ مرتبہ جس میں وہ اپنی ذاتِ مقدس کا کمال ملاحظہ فرماتا ہے صوفیہ کی اصطلاح میں جِلاء کہلاتا ہے اور جب یہ ذات اپنا ظہور تعینات میں کرتی ہے تو صوفیہ اس کو استجلاء کہتے ہیں، چنانچہ جامیؒ نے "سلسلۃ الذہب" میں لکھا ہے:

آمدنِ صورت کمالِ جلا
دیدنِ آں کمال استجلا

مطلب وہی ہے کہ وہی ذات اقدس، اللہ، "من موہن" جب اعیان ثابتہ یا اپنے صورعلمیہ پر اپنے وجود کی تجلی کرتا ہے، اپنے حسن وجمال کا ان میں ظہور کرتا ہے، تو "فتنۂ عشق وعاشقی" پیدا ہوتا ہے، تمام ذرات وجود اسی جمیلِ مطلق کے شہود کے آئینے بن جاتے ہیں اور اس حقیقت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود اپنی صورت ہی سے عشقبازی کرتا ہے، غیر کا نام ونشان محض وہم میں ہوتا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ "رمز عاشق ومعشوق" کو جس طرح صوفیائے کرام نے اوپر پیش کیا ہے اس کے سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے نظریۂ وحدت الوجود کو واضح طور پر سمجھنا ضروری ہے، اس لیے ہم یہاں اس نظریہ کا اجمالی خاکہ پیش کر رہے ہیں، تفصیل کے لیے ہماری کتاب "قرآن وتصوف"[1] کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

وجود حقیقی صرف حق تعالیٰ ہی کا ہے ؎

موجود بحق واحد اوّل باشد

حق تعالیٰ قائم بالذات ہیں۔ وہ ازل سے علیم بھی ہیں، یعنی صفت علم سے متصف ہیں۔ صفت علم حق تعالیٰ ہیں، ؎

جاوداں ہست وبود وخواہد بود

اب ظاہر ہے کہ علم بغیر معلومات کے ممکن نہیں، کیونکہ عالم کو کسی معلوم ہی کا علم ہو سکتا ہے اور معلوم ہی کو جاننے کی وجہ سے وہ عالم کہلاتا ہے۔ لہٰذا حق تعالےٰ کے ان تین اعتبارات، عالم، علم، معلوم میں ابتدا ہی سے تمیز قائم کی جا سکتی ہے۔ اب سوال پیدا

---

[1] قرآن وتصوف، از ڈاکٹر میر ولی الدین، ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی، طبع سوم ۱۹۵۶ء اس کتاب کے باب سوم اور باب چہارم میں اس مسئلہ سے بحث کی گئی ہے۔

ہوتا ہے کہ یہ معلوماتِ الٰہیہ کیا ہیں؟ اگر حق تعالیٰ ازل سے عالم ہیں تو کس چیز کے عالم ہیں؟

یہ معلوماتِ الٰہیہ ذواتِ اشیاء یا حقایقِ ممکنات کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ بات یہ مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا جتنی چیزیں ہیں سب ان کی مخلوق ہیں، اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (پ ۲۳ ع ۸) سے قرآن اس طرف اشارہ کر رہا ہے مخلوقات کو وہ جان کر پیدا کرتے ہیں، یہ نہیں کہ پیدا کر کے جانتے ہوں، ورنہ تخلیق کے قبل جہل لازم آئے گا جو ان کی شان کے منافی ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (پ ۲۹ ع ۱) کیا وہ نہ جانے جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بیں پورا باخبر ہے۔

سے قرآن حکیم اس جہل کی تردید کر رہا ہے اور خالق کو علیم یہ کہکر ثابت کر رہا ہے کہ:

وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (پ ۲۳ ع ۴) وہ بڑا پیدا کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ (ایضاً) اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

مخلوقات کو وہ جس طرح جان کر پیدا کرتے ہیں اسی طرح تخلیق کے بعد بھی وہ حق تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہیں، ان کی "معلوم" ہوتی ہیں:-

ھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (پ ۱ ع ۳) وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

سے قرآن اس چیز کو واضح کر رہا ہے۔ لہذا تمام اشیاء حق تعالےٰ کے "معلومات" ہیں ان کی ماہیت ہی معلوم ہونا ہے، یہ ازل سے علم الٰہی میں ثابت اور ان کی ذات پر عارض یا ان کی ذات میں مندرج ہیں۔

مخلوقات کو جو ازل سے حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، بالفاظ دیگر، جو ازل سے معلوماتِ حق ہیں اور جو اشیاء مخلوقہ کی ذوات یا حقایق ہیں اور جن کے مطابق اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے، صوفیائے کرام نے "اعیانِ ثابتہ" سے تعبیر کیا ہے۔

یہ صورِ علمیہ بھی کہلاتے ہیں، یہ علمِ الٰہی کے تعیّنات ہیں، ان کو "اعدام" یا "معدوماتِ حق" بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ محض علمِ حق کی صورتیں ہیں۔ خارج میں ان کا وجود نہیں ہوتا، خارجی وجود کے لحاظ سے گویا معدوم ہیں، ان کو محض "وجودِ علمی" یا "شئیتِ ثبوتی" حاصل ہے، ان ہی کے مطابق خارج میں تخلیق ہوتی ہے۔ خود یہ حق تعالیٰ کے علم میں ثابت ہیں، ان کو کبھی وجودِ خارجی نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لیے شیخ اکبرؒ نے ان کے متعلق فرمایا ہے: "الاعیان الثابتة ما شمّت رائحة الوجود اصلاً" یعنی اعیانِ ثابتہ نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی انہیں فنا نہیں، کیونکہ ان کا فنا ہونا، علمِ حق کا فنا ہونا ہے، یہ ازلی ہیں اور ابدی۔ حکماء و فلاسفہ کے اصطلاح میں ان کو "ماہیاتِ اشیاء" کہا جاتا ہے، معتزلہ کے ہاں ان کے لیے "شئ ثابت" کی اصطلاح ہے اور متکلمین نے انہیں "معدومِ معلوم" سے یاد کیا ہے۔

اعیانِ ثابتہ میں سے ہر عین کا ایک 'اقتضائے ذاتی' ہوتا ہے جس کو استعداد یا قابلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ عین کی گویا ماہیت یا فطرت یا خصوصیتِ خاصہ یا لازمۂ ذاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے اعیان سے ممیّز کیا جاسکتا ہے۔

ہر عین اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے ایک متعیّن صورت ہے، اس تعین و تمیّز کی وجہ سے اس کے خاص اقتضاءات و قابلیات ہیں جو بعینہٖ کسی دوسرے عین کے نہیں ہوسکتے۔ ہر عین اس معنی میں ایک تقیّدِ ذاتی رکھتا ہے۔ یہیں سے یہ باریک نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ علمِ الٰہی میں شروع ہی سے ایک قسم کی تقدیر سی پائی جاتی ہے، فافہم و تدبّر! اس تقدیر کو ابتداءً یہیں نہ مانیں تو خارجی کائنات میں اشیاء کی تقدیر کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی!

عین کی اس قابلیت و اقتضا کو قرآن کی زبان میں شاکلہ کہا گیا ہے:

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (پ ۱۵ ع ۹) کہدو ہر شے اپنی ذاتی قابلیت یا اقتضا کے مطابق عمل کرتی ہے۔

اور اس کی اس قابلیت "وسعت" سے زیادہ اس پر بار بھی نہیں ڈالا جاتا:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (پ۳ ع ۸) — اللہ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت یا وسعت میں ہو۔

اعیانِ ثابتہ یا ذواتِ خلق غیر مخلوق یا غیر مجعول ہیں اور ان کے اقتضاءات و شاکلات بھی (جو ان کے لوازمِ ذاتیہ ہیں) غیر مخلوق و غیر مجعول ہیں۔ اعیان کے غیر مخلوق ہونے کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے علم کی صورتیں ہیں اور حق تعالیٰ کا علم ازلی اور غیر مخلوق ہے۔ اس لیے اعیان بھی لازماً غیر مخلوق اور ازلی ہوں گے اور یہ بھی بتلایا جا چکا ہے کہ اعیان کو وجودِ خارجی نہیں، وہ محض "ثبوتِ علمی" رکھتے ہیں، یعنی علمِ حق میں ہیں اب جس کو وجودِ خارجی نہ ہو وہ مجعول یا مخلوق کیسے کہلایا جا سکتا ہے؟ اسی دلیل کو مولانا جامیؒ نے اس طرح ادا فرمایا ہے:

اعیان بفیضِ عین تا کردہ نزول — حاشا کہ بود بجعلِ جاعل مجعول!
خارج
چوں جعل بود افاضۂ نورِ وجود — توصیفِ عدم بآں نباشد معقول

اعیانِ ثابتہ یا صورِ علمیہ یا ذواتِ خلق، ذاتِ حق (یا علمِ حق) میں مندرج ہیں، لہذا ان میں من حیث الاندراج "عینیت" پائی جاتی ہے، من الازل الی الابد۔ لیکن یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ ذاتِ حق اور ذاتِ خلق میں من حیث الذات غیریت ہے من الازل الی الابد، اس لیے کہ ذاتِ خلق میں صورت ہے، وہ تعین و تمیز، حد و مقدار رکھتی ہے، اور ذاتِ حق بے صورت ہے، غیر مقید ہے، مطلق ہے، صورت کے تمام لوازم سے منزہ ہے۔ ذاتِ خلق وجودِ ذاتی نہیں رکھتی، وہ علمِ حق میں ثابت ہے، معدوم اضافی ہے۔ ذاتِ حق وجودِ ذاتی رکھتی ہے، عدمیت سے منزہ ہے۔ ذاتِ خلق صفاتِ عدمیہ سے موصوف ہے: موت، جہل، اضطرار، عجز، صُمّ، بُکم، عُمی سے متصف ہے اور ذاتِ حق صفاتِ وجودیہ سے موصوف ہے یعنی حیات، علم، قدرت، ارادہ، سماعت، بصارت، کلام سے

متصف ہے۔ ذاتِ خلق قابلیاتِ امکانیہ و فعلیہ رکھتی ہے، فعل نہیں۔ ذاتِ حق ذاتِ خلق کے قابلیاتِ امکانیہ سے منزہ ہے، کیونکہ اس میں فعل ذاتی ہے، وہ فعال حقیقی ہے۔

مختصر یہ کہ ذاتِ حق موجود، اور ذاتِ خلق معدوم، یہ عدم اضافی ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں من حیث الذات غیریت پائی جاتی ہے اور من حیث الوجود عینیتِ حقیقی، کیونکہ وجودِ حق عین وجودِ خلق ہے، یعنی وجود واحد حق بصورت اعیان خلق موجود و ظاہر ہے۔ اس کی تشریح ذیل میں کی جا رہی ہے:

اعیانِ ثابتہ یا صورِ علمیہ حق۔ یا ذواتِ خلق کی حقیقت کو اس طرح واضح طور پر سمجھ لینے کے بعد اب تخلیق کا راز آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے ۔ ع

ہش دار کہ راہ خود بخود گم نکنی!

سوال یہ ہے کہ ذواتِ اشیاء جو معلوماتِ حق ہیں، یا صورِ علمیہ حق ہیں، جو از قبیل اعراض ہیں، بالغیر علماً ثابت ہیں، ان کا نمود وجودِ خارجی میں کس طرح ہوا؟ کن فیکون کا راز کیا ہے؟

ذواتِ اشیاء یا صورِ علمیہ کے نمودِ خارجی کے متعلق تین احتمالات ہو سکتے ہیں:

(۱) صورِ علمیہ کا نمودِ خارجی بغیر کسی ذاتِ متقوم یا معروض کے ہو گیا۔

یہ احتمال عقلاً محال ہے، کیونکہ صورِ علمیہ اعراض ہیں اور بغیر وجود (معروض) کے اعراض کا ظاہر ہونا ناقابلِ تصور ہے۔ قبل تخلیق وہ عارض ذاتِ حق تھیں، بعد از خلق بھی بغیر کسی معروض کے ان کا نمود نہیں ہو سکتا۔ ھذا ھو الظاھر!

(۲) صورِ علمیہ کسی ذاتِ متقوم یا معروض کے اعراض ہیں، لیکن یہ معروض (یا وجود) غیر ذاتِ حق ہے۔ یہ احتمال بھی باطل ہے، کیونکہ وجود صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ ع الا کلُّ شیءٍ ما خلا اللہ باطلُ!

(۳) صورِ علمیہ کسی ذاتِ متقوم یا معروض کے اعراض ہیں اور یہ معروض وجودِ مطلق

ہے خود غیر ذاتِ حق نہیں۔ یہی ذات قیوم صور علمیہ کی معروض ہے، جس سے ان کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ یہی گویا ان کی حقیقتِ ہیولانی ہے جس پر یہ عارض ہیں یہی مفہوم اس آیت کریمہ کا معلوم ہوتا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (پ ۱۴ ع ۷) آسمانوں کو اور زمین کو حق سے بنایا، وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

کیونکہ "تعالیٰ" حق کی صفت واقع ہوئی ہے اور لغتہً واجب الوجود کا نام حق ہے، اور آیت کریمہ۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (پ ۱۶ ع ۱۵) اللہ تعالیٰ جو بادشاہ حق ہے بڑا عالی شان ہے۔

بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ایک اور جگہ بطور حصر ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ. اسی طرح ایک اور جگہ مؤمنین کو خاص طور پر علم عطا کیا جا رہا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (پ ۲۰ ع ۱۶)

اہل علم سے بھی خطاب فرمایا گیا ہے:

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (پ ۱۱ ع ۶)

لغتہً و شرعاً وجود مطلق کا نام ہی "حق" ہے "حق" ہی حقیقتِ ہیولانی کا مادہ ہے، باعتبار اشتقاق حق و حقیقت کا مادہ بھی ایک ہے۔ ساری صور علمیہ یا ذوات اشیاء "بالحق" ظاہر ہیں، لہٰذا تخلیق و تکوین عالم میں ذات حق، وجود حق ہی کارفرما ہے۔ یہی سرِ "ہو الظاہر" ہے جس کی تعبیر اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ سے ہو رہی ہے، یعنی اللہ ہی ظاہر ہیں اور یا اللہ ہی حق ہیں جو ظاہر ہیں، اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ ۱۸ ع ۱۱) سے اس بیان کی تائید ہو رہی ہے۔ فافہم وتدبر۔

ذرا کھول کر اس راز کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے: حق تعالیٰ بحالہ و بجد ذاتہ جیسے کے ویسے رہ کر بلا تبدیل و تغیر، بلا تعدد و بلا تکثر صفتِ نور کے ذریعہ بصورتِ معلوم

خود ظاہر ہو رہے ہیں تو معلوم کے مطابق خلق کا نمود، وجود ظاہر، میں بطور وجود ظلّی ہوا ہے اور اعتبارات الٰہیہ خلق سے وابستہ ہو گئے۔

وہی وجود منزّہ کہ با نزاہت خود
ہوا ہے جلوہ نما با شباہت ہر شے

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ (پ۲۷ ع۱۷)

خوب سمجھ لو کہ تخلیق اشیاء کا۔

(۱) عدم محض سے پیدا ہونا نہیں ہے، کیونکہ عدم سے عدم ہی پیدا ہوتا ہے۔

(۲) نہ ہی عدم محض کا اشیاء کی صورت میں نمایاں ہونا ہے، کیونکہ عدم محض تعریف ہی کی رو سے کوئی شے نہیں ہے کہ وہ ہستی کا مادّہ بن سکے یا اس کو کسی ہستی کی صورت میں ڈھالا جا سکے: العدم لایوجد! اور

(۳) نہ ہی حق تعالیٰ کا خود صورتوں میں تقسیم ہو جانا ہے کیونکہ وہ تبعیض و تجزی سے منزّہ ہیں:

تخلیق حق تعالیٰ کا مع بقائہ علیٰ ما ھو علیہ کان بصورت معلومات (یا صور علمیہ) بمصداق ھوالظاھر تجلّی فرمانا ہے۔ یہ تجلّی یا تمثل) ان صور علمیہ (ذوات اشیاء، حقایق کیانیہ) کے مطابق ہو رہی ہے جو ذات حق میں مخفی اور علم حق میں مندرج ہیں اسی تجلّی و تمثل کا نتیجہ ہے کہ اشیاء کا نمود باحکام و آثار خود بالتفصیل ان کی قابلیت ذاتی کے مطابق خارج میں جو ظاہر وجود ہے ہو رہا ہے۔ صاحب گلشن راز، محمود شبستری نے اس راز کو اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کیا ہے:

عدم آئینۂ ہستی است مطلق گزو پیداست عکس تابش حق
عدم (صور علمیہ) چوں گشت ہستی را مقابل درو عکسے اندر حال شد حاصل
شد آں وحدت ازیں کثرت نمودار یکے را چوں شمردی گشت بسیار

عدم در ذاتِ حق چوں بود صافی ازو ظاہر آمد گنجِ مخفی!
حدیثِ کنتُ کنزاً را فرو خواں کہ تا پیدا ببینی سرّ پنہاں!

جب تم پر یہ راز آشکار ہو چکا کہ حق تعالیٰ ہی صفتِ نور سے بہ صورتِ معلوم خود ظاہر ہو رہے ہیں تو تم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ ذاتِ مطلق کے مرتبۂ وحدت میں چار اعتبارات ہوتے ہیں:

وجود، علم، نور، شہود۔ یہ محض صلاحیتِ ذات ہیں، تعددِ وجودی نہیں رکھتے، ملحوظ ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ موجود ہیں (وجود)، اپنی ذات و صفات و افعال پر اجمالاً مطلع ہیں (علم)، اپنے آپ پر ظاہر و روشن ہیں (نور) اور اپنی ذات کے اس طرح آپ شاہد ہیں (شہود)۔ ان اعتبارات کو ذاتی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کو صفات نہیں قرار دیا جا سکتا۔[1] ان چاروں اعتبارات میں تمام صفات و اسمائے الٰہی اسمائے کیانی مندرج ہیں، لاندراج المفصل فی بطون الذات کالمفصل فی المجمل وکالشجر فی النواۃ۔ غنائے مطلق اس مرتبہ کے لے لازمی ہے، کیونکہ ذاتِ مطلق اس اجمالی مشاہدے کی وجہ سے تمام تفصیلات سے مستغنی ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْن سے اسی جانب اشارہ ہے:

دامانِ غنائے مطلق پاک آمد پاک زآلودگی نیاز ماشتے خاک
چوں جلوہ گر و نظارگی جز او نیست گر ما و تو درمیاں نباشیم چہ باک (جامی)

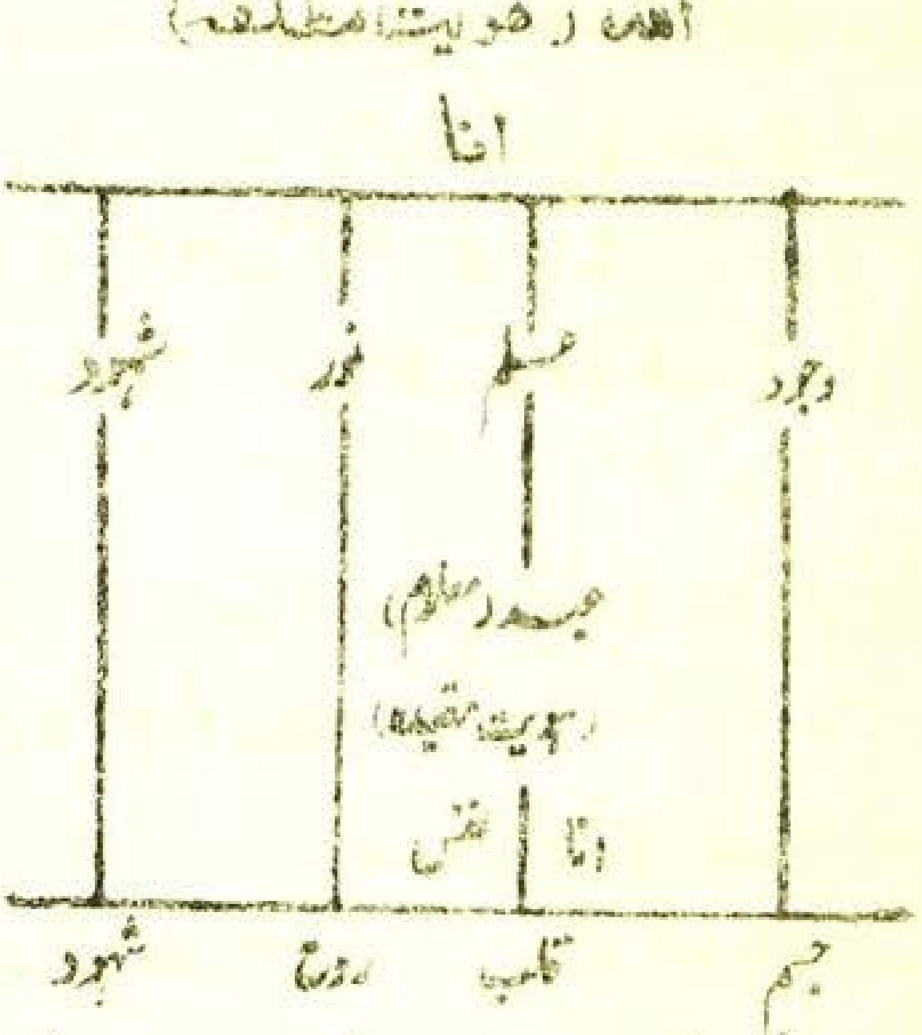
جب حق تعالیٰ صفتِ نور کے ذریعہ بحالہٖ وبحہ ذاتہٖ جیسے کے ویسے رہ کر بلا تغیر و تبدل، بلا حلول و اتحاد بصورتِ معلوم سے ظاہر ہو رہے ہیں، تو حق تعالیٰ کا نور معلوم سے متعلق ہو کر روح، ان کا علم معلوم سے متعلق ہو کر قلب، ان کا وجود معلوم سے متعلق ہو کر جسم اور ان کا انا معلوم سے متعلق ہو کر نفس

---

[1] اس پر دلیل کے لیے قرآن اور تصوف ص ۱۰۴، ۱۰۵ ملاحظہ ہو۔

کہلاتا ہے۔ ان سب کا مرکز ہُویّتِ مُطلقہ ہے۔ فافہم و تدبّر

اس کی وضاحت اس نقشے سے ہو سکتی ہے:



خوب سمجھ لو، ہمارا نفس یعنی ہماری ذات درحقیقت وہی صورتِ علمیہ (عینِ ثابتہ) ہے جو علمِ حق میں ثابت ہے جس کو فی نفسہ وجود نہیں، یہ قطعاً معدوم فی الخارج ہے: ما شمّت رائحة الوجود اصلاً، اور چونکہ قلبِ حقائق محال ہے، معدوم کبھی موجود نہیں ہو سکتا، پس جو موجود ہے وہ فی الحقیقت ذاتِ واجب الوجود ہے: لا موجود الا اللہ، وحدہٗ لا شریک لہٗ۔ حق تعالیٰ ہی کا انا صورتِ معلوم میں نفسِ انسانی کہلاتا ہے اور زبانِ قوم میں ہویتِ مقیدہ؎ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس حقیقت کو کسی عارف نے سوالیہ طرز میں کیا خوب بیان کیا ہے:

از حق جز حق دگر چہ روید بابا؟ ۔۔۔ از حق جز حق دگر چہ گوید بابا؟

در شدّتِ این ظہور پنہان گشتہ ۔۔۔ حق را جز حق دگر کہ جوید بابا؟

شیخ اوحد الدین کرمانیؒ جو شیخ اکبرؒ کے ہمعصر تھے اور ان کے ہم صحبت بھی رہے ہیں:

؎ حاشیہ صفحہ ۱۵۰ پر دیکھیے۔

صاف صاف کہہ آئے ہیں:

ذاتم ز ورائے حرف و بیروں ز حداست　　وز چشمۂ لطفِ آبِ حیاتم مدد است

یعنی حقیقتِ من"

علت ز احد بہ اوحد آمد حرفے　　علت بگذار کاینک اوحد احد است!

حضرت ابو حاتم عطارؒ استاد ابو سعید خرازؒ نے اسی یافت کے بعد فرمایا تھا: "کسے ماندہ کہ می گوید اللہ؟" حضرت شبلیؒ اہلِ بغداد سے فرمایا کرتے تھے: "شما می گوئید اللہ نفساً بنفس و من می گویم حقاً بحقٍ" قل اللہ ثم ذرھم! شیخ الاسلام عبداللہ انصاریؒ کا ارشاد ہے:

"او با جویندۂ خود ہمراہ است، دستِ جویندۂ خود گرفتہ در طلبِ خود می تازاند! ہوالکل بالکل"

کسی صوفی کا مشہور قول ہے:

"ہمہ خلق می گوید یکے واز ہزار درمی آویزند، وایں قوم می گوید یکے واز نشان خود می گریزند"

الا کل شیٔ ما خلا اللہِ باطلُ　　وکلُّ نعیمٍ لا محالۃ زائلُ[1]

صاحب گلشن راز قدس سرہ فرماتے ہیں:

انا الحق کشفِ اسرار است مطلق　　بجز حق کیست تا گوید انا الحق؟

یعنی انا الحق کہنا بے شک و شائبہ و شبہ اسرار کا اظہار ہے، ہرگز بے معنی و بیہودہ نہیں، حق کے سوا دوسرا موجود ہے کہاں جو انا الحق کہے:

چو کردی خویشتن را پنبہ کاری　　تو ہم منصور وار ایں دم برآری

وحدت الوجود کے قائلین کے خیالات کی اس تلخیص سے کسی کو یہ خیال پیدا نہ ہونا

حاشیہ

لہ آپ شیخ رکن الدین سنجاسیؒ کے مرید ہیں اور وہ شیخ قطب الدین ابہریؒ کے اور وہ شیخ ابو النجیب عبدالقادر سہروردیؒ کے۔ آپ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی صحبت میں رہے ہیں، کہا جاتا ہے کہ آپ کو مشاہدۂ جمالِ ظاہری کی طرف بہت میلان تھا۔ شیخ شمس الدین تبریزیؒ نے آپ سے پوچھا کہ کیا کرتے ہو؟ جواب دیا "ماہ را در طشت آب می بینم" مولانا جلال الدین رومیؒ سے کہا گیا کہ شیخ اوحد الدین شاہد باز تھے لیکن پاک باز، آپ نے فرمایا "کاش کردے و گذشتے" وفات ۶۳۵ھ میں ہوئی (سفینۃ الاولیاء ص ۱۷۹) حاشیہ صفحہ [1] خبردار ہو، اللہ کے سوا ہر چیز کا وجود باطل ہے اور ہر نعمت لازمی طور پر زائل و فنا ہونے والی ہے! یہ لبید کا شعر ہے جس کو رسول اللہ صلعم نے پسند فرمایا تھا۔

چاہیے کہ وہ عینیتِ محضہ کے قائل ہیں اور حلول و اتحاد کو جائز سمجھتے ہیں۔ وہ قطعاً اس بات کے تو قائل ہیں کہ "حق ظاہر بصورت اشیاء و اشیاء موجود بہ وجود حقیقی حق" لیکن مظہر کے مظاہر میں ظہور پذیر ہونے کی وجہ سے مظہر میں تغیر و تبدل، تجزّی و تقسیم، حلول و اتحاد نہیں ہوتا۔ ظاہر و مظہر، رب و عبد، حق و خلق میں جو نسبت ظہور ہے اس کا حکم دوسری تمام نسبتوں سے مختلف ہے، کیونکہ ظاہر تمام اعتبارات سے مظہر کا عین نہیں اور نہ تمام اعتبارات سے اس کا غیر، لاعین ولاغیر، نہ صرف عینیتِ محضہ اور نہ صرف غیریتِ محضہ! اس کی تفصیل و تشریح ہم نے قرآن و تصوف کے باب سوم و چہارم میں کی ہے، آپ چاہیں تو اس طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

ہمارے اس سارے بیان کا خلاصہ ابوالوفا خوارزمی کے ان اشعار میں ادا کیا جا سکتا ہے:

من از تو جدا نہ بودہ ام تا بودم ۔۔۔ ایں است دلیلِ طالعِ مسعودم

در ذاتِ تو ناپدید ار معدومم ۔۔۔ در نورِ تو ظاہرم اگر موجودم!

صوفیائے کرام کے اس نظریۂ وحدت الوجود کو جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اگر تم سمجھ لوگے تو پھر خواجہ حافظ شیرازی، شیخ فخرالدین عراقی، شیخ اوحدالدین کرمانی، عبدالرحمٰن جامی، شیخ سعدی شیرازی، حکیم سنائی غزنوی، شیخ نظامی گنجوی، مولٰنا جلال الدین رومیؒ اور دوسرے تمام عارفین نے اپنے کلام میں عشق کے متعلق جو کچھ کہا ہے آسانی سے سمجھ سکو گے۔ مثال کے طور پر ہم عارف جامی کے ان اشعار کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا پس منظر وہی نظریۂ وحدت الوجود جس کی ہم نے اوپر تصریح کی ہے، اور بتلایا گیا ہے، کہ عشق کی تجلی سے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے اور عشق کا ہنگامہ ہر جا برپا ہے:

بروں زد خیمہ ز اقلیمِ تقدس ۔۔۔ تجلی کرد بر آفاق و انفُس!

کمالِ ذاتی ۱۲ ۔۔۔ کمالِ اسمائی ۱۲

از یک لمعہ بر ملک و ملکِ تافت ۔۔۔ ملک سرگشتہ خود را چوں فلک یافت

روشنی ۱۲ ۔۔۔ فرشتہ

ز ہر آئینہ بنمود روئے
بہر جا خاست از وے گفتگوئے

ہمہ سبوحیاں سبوح جویاں
شدند از بیخودی سبوح گویاں

ز غواصان ایں بحر فلک فلک
برآمد غلغلہ سبحان ذی الملک

ز ذرات جہاں آئینہ ساخت
ز روئے خود بہر یک عکس انداخت

ازاں لمعہ فروغے بر گل افتاد
ز گل شورے بجان بلبل افتاد

رخ خود شمع ازاں آتش برافروخت
بہر کاشانہ صد پروانہ سوخت

ز نورش تافت بر خورشید یک تاب
برون آورد نیلوفر سر از آب

ز رویش روئے خود آراست لیلی
بہر مویش ز مجنوں خاست میلی

لب شیریں بہ شکر ریز بکشاد
دل از پرویز برد و جاں ز فرہاد

جمال اوست ہر جا جلوہ کردہ
ز معشوقان عالم بستہ پردہ!

زلیخا را دمار از جاں برآورد
سر از جیب مہ کنعاں برآورد

بہر پردہ کہ بینی پردگی اوست
قضا جنباں بردل بردگی اوست

بعشق اوست دل را زندگانی
بشوق اوست جاں را کامرانی

دلے کاں عاشق خوباں دلجوست
اگر داند وگرنہ عاشق اوست!

الا تا در غلط تا نئی نہ گوئی
کہ از ما عاشقی از وے نکوئی

توئی آئینہ، او آئینہ آرا
توئی پوشیدہ، و او آشکارا

کہ ہیچ نیکوی، عشق ستودہ
ازو سر بر زدہ در تو نمودہ!!

چو نیکو بنگری آئینہ ہم اوست
نہ تنہا گنج بل گنجینہ ہم اوست

جامیؒ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ حق تعالیٰ ہی کائنات کے ہر ذرہ میں خود تجلی کر رہے ہیں، ان ہی کی تجلی سے حسن کی نمائش ہے اور اپنے حسن کے وہ خود شاہد

ہیں، اپنی ہی صورت سے خود عشق کر رہے ہیں! بالفاظ دیگر حق تعالیٰ نے خود اپنی ذات پر تجلی کی، یہاں ناظر و منظور کی نسبت پیدا ہوئی اور عاشق و معشوق کا نام پیدا ہوا اور طالب و مطلوب کی صفت ظاہر ہوئی۔ جب ظاہر کو باطن پر آشکار کیا گیا تو عاشق کا ظہور ہوا اور جب باطن کو ظاہر پر آشکار کیا گیا تو نام "معشوق" پیدا ہوا۔ اس نکتہ کو کسی عارف نے یوں ادا کیا ہے:۔

یک عینِ[1] متفق کہ جز او ذرہ نبود   چو گشت ظاہر ایں ہمہ اغیار آمدہ
اے ظاہر تو عاشق و معشوق باطنت   مطلوب را کہ دیدہ طلبگار آمدہ

عشق از روئے معشوقی عاشقی کا آئینہ ہوتا ہے تاکہ اس آئینہ میں اپنے ہی جمال کا مطالعہ خود کرے اور عاشقی کی جہت سے معشوقی کا آئینہ ہوتا ہے تاکہ اس میں اپنے اسماء و صفات کے کمال کو دیکھے ہر چند کہ دیدۂ شہود میں ایک ہی مشہود ہے لیکن جب ایک ہی چہرہ کو دو آئینوں کے سامنے رکھا جاتا ہے تو ہر آئینہ میں دوسرا چہرہ نظر آتا ہے گو حقیقت میں چہرہ صرف ایک ہی ہے:

وما الوجہ الا واحد غیر انہ[2]   اذا انت عددت المرایا تعددا

غیرے چگونہ روئے نماید چو ہر چہ ہست
عین دگر یکیست پدیدار آمدہ

جب غیر کا درحقیقت وجود ہی نہیں تو جمال اس کا کیسے ہو سکتا ہے:

آنرا کہ وجود و نمود نبود   اورا از کجا جمال باشد؟

عشق کی اس حقیقت کو جان کر ہی تو میر سید حسینی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

---

[1] عین متفق سے مراد عین ثابتہ کہ عالم کی ذات یا ماہیت ہے اور جو قبل تخلیق عالم علم الٰہی میں تھا اور اب بھی ہے جس کو صوفیہ مقام واحدیت کہتے ہیں "متفق" یعنی جس سے مختلف اعیان ثابتہ اپنی حقیقت سے کبھی مختلف نہیں ہوتے۔

[2] صورت تو صرف ایک ہی ہے لیکن جب تم متعدد آئینے اس کے سامنے رکھو گے تو متعدد صورتیں نظر آئیں گی۔

"میلِ طبعی را عشق گفتن حیوانی است، خوشۂ گندم را شجرۂ خلد خواندن شیطانی است، عشق یکے دریائے بے پایان است آخر چہ پنداری کہ آخر چہار پایان است و"

یعنی میل طبعی کا نام عشق رکھنا حیوانیت ہے اور گیہوں کے خوشہ کو جنت کا درخت قرار دینا شیطانیت ہے، عشق دراصل ایک اَن تھاہ سمندر ہے تو کیا اس کو چارپاؤں کے جانوروں کا چارہ سمجھ رکھا ہے؟

عشق است کلید ایں طلسمے کہ تراست
تا باز رہی ز رسم و اسمے کہ تراست

مطلب یہ ہے کہ جمال حق تعالےٰ ہی کی ذاتی صفت ہے: اللہ جمیل و یحب الجمال نہ ہی چشم مجنوں سے اپنے ہی جمال پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کو حسن لیلیٰ میں دیکھتے ہیں اور اپنی ہی ذات کو محبوب رکھتے ہیں:

مجنونِ خود خود بودہ، لیلیٰ بخود نمودہ ۔ لیلیٰ کجا، مجنوں کجا، خود بودہ خود در بودہ

(عراقی)

مردِ عشق تو ہم توئی کہ توئی
دائما در جمالِ خود نگراں

"او بوجودِ جمال موجود، و بشہود محبت مشہود، پس وجودش جمال است، جز بدو شہود محال" (عراقی)
مگر صورت پرست غافل نہیں جانتا کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔

صورت پرستِ غافل معنی چہ داند آخر ۔ کہ با جمالِ جاناں پنہاں چہ کار دارد؟

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت ابو سعید مہنہؒ کے سامنے یہ آیت تلاوت کی گئی: یحبھم و یحبونہ، فرمایا: بحق الحق فانہ لا یحب الا نفسہ، یعنی وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتا:

بے بود شما "یحبھم" من گفتم ۔ دُرے کہ نسفتہ بود آں را سفتم
من بودم و من شنیدم و من گفتم ۔ جز من دگرے نیست نا شنیدم گفتم

باب (۵)

عشقِ مجازی

عشق کی دو قسمیں ہیں: عشق حقیقی و عشق مجازی،

عشق حقیقی (جس کا بیان باب سوم میں کیا گیا ہے) حق تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات و افعال سے محبت کا نام ہے۔ یہ عشقِ جاودانی ہے۔

عشق مجازی کی دو قسمیں ہیں: عشق حیوانی یا بہیمی، اور عشق نفسانی،

عشقِ حیوانی یا بہیمی

عشق حیوانی بقول نظامیؔ "بازیچۂ شہوت و جوانی" ہے۔ اس کا مبدا، شہوت بدنیہ و طلبِ لذت بہیمیہ ہوتا ہے، اس عشق کا کشتہ معشوق کے ظاہر یعنی اس کے رنگ و شکل و تناسبِ اعضا پر فریفتہ ہوتا ہے، جو امور بدنی ہیں اور وہ حظِّ نفسانی کا طلب گار ہوتا ہے۔ اسی عشق میں اکثر آدمی گرفتار ہوتے ہیں اور علمائے نفسیات کے تحقیق میں پیرزن میں بھی یہ حرص موجود ہوتی ہے، جب عشق میں حرص جماع کی ہوتی ہے تو یہ عشق نہیں فسق ہے، عشق نہیں ہوس ہے بقول رومی:

عشق نبود ایں کہ در مردم بود
ایں فسادِ خوردن گندم بود

اس عشق کو "عشق سوری" یا صورتوں کا عشق کہا گیا ہے، عشق ازواج یہ ازدواج (میاں بیوی کی محبت) کو چھوڑ کر اس عشق کو ممنوع شریعت، مخطور طریقت و دور از حکمت قرار دیا گیا ہے

ممنوع شریعت اس لیے کہ حکیم جلیل محکم تنزیل میں فرماتا ہے:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ — آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی
وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (سپارہ ۱۸، رکوع ۱۰) — رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

حدیث نبوی مشہور ہے:

النظر سہم من سہام الابلیس — نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔

نیز النظر راس الذنوب — نظر (یعنی نامحرم کو دیکھنا) سب گناہوں کی جڑ ہے۔

اور عارفین طریقت کا قول ہے:

من غض بصرہ عن الشہوات و — جس نے اپنی آنکھ شہوتوں سے بند کر لی اور
عمر باطنہ بدوام المراقبۃ — اپنے باطن کو دوام مراقبہ سے معمور کر لیا اور
وظاہرہ باتباع السنۃ — اپنے ظاہر کو اتباع سنت سے آراستہ کیا
لم یخطأ فراستہ۔ — اس کی فراست نے خطا نہ کی۔

اور اس عشق کے متعلق حکما کا قول ہے:

العشق من مرض سوداوی — عشق ایک سوداوی مرض ہے۔

عارف رومی نے اس عشق سوری کی یوں مذمت کی ہے:

عشق ہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

یعنی جس عشق کا مقصد محض صورت بینی ہو اور جو رنگ و روغن کا گرویدہ ہو، اس رنگ و صورت کے زوال کے بعد اس کو حسرت و ندامت و ننگ کے سوا کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ کسی جگہ اور فرماتے ہیں:

بیں در آنکہ عشقہائے صوری — عشق بر صورت نہ بر روئے ستی

آنچہ معشوق است صورت نیست آں　　خواہ عشق ایں جہاں خواہ آں جہاں
آنچہ بر صورت تو عاشق گشتۂ　　چوں بروں شد جاں چرایش ہشتۂ؟

بر کلوخے دل چہ بندی اے سلیم　　رو طلب اصلی کہ پاید او مقیم
چوں زر اندود است خوبی در بشر　　ورنہ چوں شد شاہد تو پیر خر
چوں فرشتہ بود ہمچوں دیو شد　　کاں ملاحت اندر آں عاریہ بد

چند بازی عشق با نقش سبو　　بگزر از نقش سبو رو آب جو
بر امید زندہ کن اجتہاد　　کو نگردد بعد روزے جماد
رو تنت را ناشکستہ جو بجاں　　دل طلب کن دل منہ بر استخواں

عشق بر مردہ نباشد پائدار　　عشق را بر حی و بر قیوم دار
عشق آں زندہ گزیں کو باقی است　　از شراب جانفزایت ساقی است

عارف رومی کی تعلیمات جو عشق سے متعلق ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عشقِ صورت تین وجوہ سے ہو سکتا ہے:

(۱) عاشق کو حق سبحانہ تعالیٰ کا مشاہدہ کسی صورت کے تقید کے بغیر حاصل ہو اور صورت اس کو اس مشاہدہ سے باز نہیں رکھتی اور اس کا مقصود ظاہر کا مشاہدہ ہے نہ کہ مشاہدۂ مظاہر، ظاہر یعنی حق تعالیٰ کا جمال مظاہر سے متجلی ہے اور عاشق ظاہر ہی کا مشاہدہ کر رہا ہے نہ کہ مظہر کا۔ یہ صورت کا عشق نہیں بلکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ

لہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے، وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُونَ (پ ۲۳ ع ۳)
ہم جس کی زیادہ عمر کر دیتے ہیں تو اس کی طبعی حالت میں الٹا کر دیتے ہیں، سو کیا وہ لوگ نہیں سمجھتے

کا عشق ہے، اور وہ صورت میں حق سبحانہ تعالےٰ کا مشاہدہ کرنا ہے۔ کسی عاشق حق کے یہ اشعار اس مفہوم کو خوب ادا کرتے ہیں:

گر خزاں در بہار می بینم! جلوۂ رنگ یار می بینم!
در رُخِ زشت و نیکِ اہلِ جہاں نورِ حق آشکار می بینم!
دل بحق، چشم سر بسوئے بتاں طرفہ تر ایں بہار می بینم!
کعبۂ و دیر را بداں اصغر
خانۂ آں نگار می بینم

یہ حال تو کاملین کا ہے۔ ان عارفین کو جو حق تعالےٰ کے جمال کو صُوَرِ جمیلہ میں مشاہدہ کرتے ہیں "اصحاب تجلّیِ صوری" کہتے ہیں[1]۔

(۲) عاشق صورت میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس مظہر ہی کی حد تک مقتصر ہوتا ہے اور اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ اب یہ اقتصار و تحدید تو نقصان ضرور ہے لیکن مظاہر صور میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ نقصان نہیں، اگرچہ کہ یہ صورت کا عشق حق تعالیٰ ہی کا عشق ہے جو اس صورت سے ظاہر ہو رہے ہیں تاہم اہل کمال اس مرتبہ کو اَدوَن (پست) قرار دیتے ہیں۔ مغربیؒ باآواز بلند فرماتے ہیں:

من کہ در صورت خوباں ہمہ او می بینم تو مپندار کہ من آں روئے نکو می بینم
نیست در دیدۂ من ہیچ قفا (پشت) بل ہمہ روست تو قفا (پشت) می نگری من ہمہ رو می بینم

روئے ہمہ خوبان جہاں را بتماشا دیدیم، ولے آئینۂ روئے تو دیدیم
از مغربیؔ احوال میرس کہ او را سودا زدۂ طرۂ ہندوئے تو دیدیم

(۳) عاشق صرف صورت و رنگ کا ہو اور صرف صورت بینی اس کا مقصود ہو

[1] اس نکتہ کے سمجھنے کے لیے گزشتہ باب میں "راز تخلیق" جو بیان کیا گیا ہے، اس پر غور کرو۔

نہ کہ اس حقیقت کا مشاہدہ جو اس صورت سے ظاہر ہے، یہ عشق نہیں کہلاتا بلکہ "صورت پرستی" ہے اور رنگ وصورت کے زوال کے بعد اس کا انجام حسرت وندامت کے سوا کچھ نہیں، جیسا کہ اوپر تصریح کی گئی۔ اسی صورت پرستی کو ہم نے اوپر ممنوعِ شریعت ومحظورِ طریقت کہا ہے۔ اسی عشق سے منع کیا گیا ہے اور اس کو مرض سوداوی قرار دیا گیا ہے، اسی عشق کے متعلق کسی عارف نے کہا ہے:

وعِش خالیاً فالحبُّ اوّلُہ عنا

واوسطہ سقمٌ وآخرہ قتلٌ!

یعنی زندگی اس حال میں بسر کر کہ عشق سے تیرا قلب خالی ہو، کیونکہ اس عشق کے شروع رنج ہے، درمیان میں بیماری اور اس کی انتہا موت ہے۔

نصحتُکَ علماً بالھوی والذی ارٰی

مخالفتی فاختر لنفسکَ ما یحلوا

میں نے محبت کے علم کے بعد تجھے یہ نصیحت کی ہے، جو شخص میری رائے سے مخالفت رکھتا ہے اس کو ایسی چیز اختیار کرنی چاہیے جو اس کے لیے شیریں ہے۔

شیخ محمد حیات ہندی مدنیؒ نے اپنے ایک رسالہ میں جس کا نام "عشق النسوان والمردان"[1] ہے لکھا ہے کہ شیطان کا سب سے بڑا مکر یہی فتنہ عشق صور مردان ونسوان ہے۔ اس بلا (جمع امرد یعنے طفل بے ریش) سے زیادہ کوئی آفت نہیں۔ یہ وہ فتنہ ہے جس نے نفوس کو غیر خالق کا غلام بنا رکھا ہے جس نے عشاق کے قلوب کو ذلیل وخوار کر دیا ہے، یہ وہ آفت ہے جس نے عشق و توحید میں جنگ چھیڑ دی ہے اور ہر عاشقِ صورت کو شیطان مرید کا مرید کر دیا ہے، ان کے دل گرفتارِ ہویٰ وہوس ہو گئے، جان محنت میں پڑ گئی، جی فتنے سے بھر گیا"

---

[1] اس کتاب کا یہ سارا مواد ہم نے نواب صدیق حسن خاں کی کتاب: اللیعا والتی سے لیا ہے جو مطبع سعید المطابع بنارس میں ۱۳۰۴ھ میں طبع ہوئی اور اب نایاب ہے دیکھو، ص ۲۱ وغیرہ۔

قلب و مرشد کے درمیان دیوار حائل ہو گئی، راہِ ہدایت سے دل پھر گیا۔ غلاموں کی طرح کم داموں پر دل بک گیا، حقیر لذت کے عوض اس کا سودا کر دیا گیا، محبوب خسیس سے جی لگا کر وہ چیز حاصل کی جس کا الم زیادہ اور لذت کم ہے، اگر وصل ہاتھ آیا تو سمجھو کہ مضرت کا ایک بڑا سبب پیدا ہو گیا، کیونکہ یہ محبوب بہت جلد دشمن ہو جاتا ہے اور اپنے محب سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے، گویا اس کو کچھ واسطہ ہی اس سے نہ تھا۔

یہ سب کچھ تو دنیا میں پیش آتا ہے، رہی آخرت، جہاں اہلِ تقویٰ کے سوا ہر دوست اپنے دوست کا دشمن ہو جاتا ہے، عذاب الیم والم عظیم منتظر ہے، اس محبوب کی حسرت کا اندازہ کرو جس نے اپنا دین و ایمان اپنی جان و دل حقیر سی شہوت و لذت عاجلہ پر سستے داموں حبیب اول حق عزوجل کی بجائے ایک فانی اسریع الزوال، گریزپا ہستی کے ہاتھ بیچ ڈالی، شہوت بھی کیسی جس کی لذت تو جاتی رہی، محنت و شقاوت باقی رہ گئی، ذَهَبَتْ لَذَّتُهَا وَبَقِيَتْ تَبِعَتُهَا، جس سے حاصل شدہ مسرت تو غائب ہو گئی، حسرت حاضر رہی، ایسے محب کو دو حسرتوں نے گھیر لیا: ایک تو یہ کہ محبوب حقیقی و نعیم مقیم فوت ہوئے، دوسری یہ کہ عذاب الیم میں گرفتار ہونا پڑا، اسی وقت اس فریب خوردہ کو معلوم ہوگا کہ کیا بیچا کیا مول لیا؟ جو ہستی اس قابل ہی نہ تھی کہ اس کے خادم یا غلام کی جگہ لیتی وہ اس عشق فسق کے طفیل اس کی گردن کی مالک بن گئی، کیونکہ عشق مالک کو مملوک اور مملوک کو مالک بنا دیتا ہے۔ بھلا اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ بادشاہ تخت سے اتار دیا جائے اور وہ تخت ایک غلام کو مل جائے، یہ اس کے ہاتھوں مقہور و مجبور ہو جائے اور وہ اس سے تکبر و غرور کے ساتھ پیش آئے!

عاشقِ صورت سے زیادہ بدبخت قابل تصور نہیں۔ فراقِ یار میں روتا ہے، وصل میں خوفِ فراق سے جی کھوتا ہے، نیند گئی، آرام گیا، چین مٹ گیا، جان عذاب میں پھنس گئی، جسم گھلنے لگا! یہ ساری گت غیر اللہ کے لیے بنی! کون غیر اللہ؟

جب تم اس سے ملنا چاہو تو وہ بھاگے، وعدہ کرے تو وفا نہ کرے، ہجر میں پھانسے، رقیب سے ملے، یہ عیش نہ ہوا مصیبت ہوئی، اس سے تو مرنا بہتر، معشوق قلیل الوفا، کثیر الجفا ہوتا ہے، سینکڑوں اس کے خریدار ہوتے ہیں، خائن، کثیر التلوّن ہوتا ہے، عاشق کو اس کی طرف سے نہ جان کا امن ہوتا ہے نہ مال کا! وصلِ دائم میسر نہیں ہوتا، سوائے جزع و فزع کے کوئی راہ نظر نہیں آتی، اس عذاب عاجل سے رہائی کی کوئی صورت نہیں!

حاصل یہ کہ جو شخص حق تعالےٰ کے سوا کسی دوسرے کی محبت کو اپنے قلب میں جگہ دیتا ہے وہ مبتلائے مصیبت ہوتا ہے، جتنا دلی تعلق محبوب سے ہوتا ہے، اتنا ہی غم و الم اس کے نصیب میں ہوتا ہے، اگر محبوب ہاتھ بھی آجائے تو وہ الم جو اس سے پہلے پاچکا ہے وہ اس لذت کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے، تو پھر ذرا سی لذت سے کیا حاصل؟ اسی لیے عارفین نے کہا ہے کہ جس نے باقی کی محبت سے منہ موڑ کر فانی کی محبت کا شغل اختیار کیا وہ اسی لائق ہے کہ نارِ عشق سے جلایا جائے:

هل للعبد المربوب ان يحب غير ربه المطلوب؟ — کیا بندۂ مربوب کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنے رب کے سوا جو اس کا مطلوب حقیقی ہے کسی اور سے محبت کرے؟

غیر حق ہر چہ دلت را ربود — سدِّ راہ تو ہماں خواہد بود

غیر اللہ سے محبت کرنے والے کا یہی انجام ہے کہ وہ تباہ حال، خراب و خستہ و محزون و مبتلا رہتا ہے، رات دن رنج فراق یا شوق وصال، غم رقیب یا صدمۂ ہجر میں جلا بھنا کرتا ہے! اب ؎

باضعفِ خویش پشۂ بیچارہ چوں کشد — بارے کہ پیل طاقتِ حملش نیاورد

اور جو خوش نصیب حق تعالےٰ کا محب ہوتا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرو کہ اگر وہ اپنے محبوب حقیقی کی طرف ایک بالشت جھکتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی طرف ایک

ہاتھ بڑھتا ہے، اگر وہ ایک ہاتھ اس کی طرف سبقت کرتا ہے تو وہ ایک "باع" (دونوں ہاتھوں کا پھیلاؤ) اس کی طرف آتا ہے، اگر یہ اس کی طرف چل کر جاتا ہے تو وہ اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں اس نعمت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی عشق کی طلب ہر انسان کا فریضہ ہے۔ اسی عشق سے زندگی زندگی ہے۔ اسی عشق سے سلوک الی اللہ طے ہوتا ہے، یہی عشق بنائے سلوک ہے۔ اسی عشق کی طلب بزرگوں نے کی ہے:

من از تو بجز عشق نخواہم بجہاں ہجران و وصال تو مرا شد یکساں
بے عشق تو باشم و ندارم ساماں خواہی تو وصال بخش خواہی ہجراں

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الجواب الکافی لمن سأل الدواء الشافی" میں عشق پر تفصیلی بحث کی ہے اس بحث کا خلاصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں[1]:

عشق بہیمی یا عشق صوری کی علامہ نے مذمت کی ہے کہ اس عشق میں نہ کوئی مصلحت دینی ہے اور نہ کوئی مصلحت دنیوی، بلکہ دین و دنیا دونوں کا بگاڑ ہے، ان مفسدات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اس عشق کی وجہ سے انسان اپنے خالق و رب کے ذکر اور اس کی محبت کو چھوڑ کر مخلوق و مربوب کی محبت و ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے کیونکہ ایک دل میں یہ دو حُب جمع نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کسی انسان کے دو دل ہوتے ہیں:

یا دوست گزیں کمال یا جاں یک خانہ دو میہماں نگنجد

(۲) عاشق کا دل معشوق کی محبت کی وجہ سے عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے! قانونِ الٰہی ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس نے محبوبِ حقیقی عزّ و جل کے سوا کسی اور سے محبت کی، وہ معذب بغیر ہوا، عاشق گو عشق کو شیریں سمجھے مگر ہے وہ اعظم عذابِ قلب!

---

[1] الجواب الکافی لمن سأل عن الدواء الشافی مصنفہ علامہ ابن القیم، مطبوعہ مطبع الخلیلی فی بلدہ آرہ (بہار) سنہ ۱۳۸۳ھ ساری کتاب قابلِ مطالعہ ہے اس کے مختلف حصوں سے متن میں تلخیص پیش کی گئی ہے ۱۲

(۴) عشق سے بڑھ کر کوئی چیز مصالح دارین کو ضایع کرنے والی نہیں، کیونکہ دین کی ساری مصالح جمعیتِ قلب کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں، جب قلب بارگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دین درست ہوتا ہے۔ عشق صُوَر سے بڑھ کر کوئی چیز پریشان خاطر و پراگندہ دل نہیں:

ہر کجا سلطان عشق آمد نماند ۔۔۔ قوّتِ بازوئے تقویٰ را عمل!

رہے مصالح دنیوی، سو وہ حقیقت میں تابع مصالحِ دین ہیں۔ جب دین ہی نہ رہا تو دنیا کس کام کی؟ وہ بالکل ضایع ہو جاتی ہے!

(۵) آگ لکڑی کی طرف اتنی تیزی سے نہیں دوڑتی جتنی کہ آفتیں اور بلائیں عشاق صور کی طرف دوڑتی ہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، جتنا اتصال قلب کا عشق صور سے ہوتا ہے اتنا ہی دور، وہ محبوبِ حقیقی سے جا پڑتا ہے! سب سے زیادہ دور وہ دل ہیں جو محض صورتوں کے عاشق ہیں، جب دل جان آفرین سے دور ہوا ہر طرف سے آفات نے اس کو آگھیرا! نیلِ غم میں وہ غرق ہوا!

شد بدامِ عشق مرغِ روح قید! ۔۔۔ تا نیرو ننگرنہ آرام را! (صافی)

(۶) جب عشق کی گرفت قلب پر قوی اور مضبوط ہو جاتی ہے تو عاشق کا ذہن بگڑ جاتا ہے، اس میں وسوسے پیدا ہونے لگتے ہیں، اکثر عاشق دیوانہ ہو جاتا ہے، عقل ماری جاتی ہے۔ آدمی میں اشرف و اعلیٰ چیز عقل ہے، انسان حیوانات سے ممتاز اسی عقل کی وجہ سے ہے، جب عقل ہی ختم ہو گئی تو اس میں اور حیوان میں کچھ بھی فرق باقی نہ رہا، گو صورت آدمی کی سی ہے، بلکہ حیوان اس سے اچھے حال میں ہوتے ہیں:

عمر با در کوئے دانش، خانہ می ساخت عقل ۔۔۔ موج زد دریائے عشق و خانہ از بنیاد رفت (جامی)

(۷) عشق ہوش و حواس کو گم کر دیتا ہے، ظاہر و باطن دونوں کو بگاڑ دیتا ہے، باطن کا فساد تو فسادِ قلب کا تابع ہوتا ہے، جب قلب ہی بگڑ گیا تو آنکھ کان زبان سب بگڑ گئے

معشوق کا ہر عیب ہنر، ہر قبیح حسن نظر آنے لگتا ہے، حدیث نبوی اس پر ناطق ہے:
حُبُّكَ الشَّيءَ يُعمِي وَيُصِمُّ، کسی شے کی بھی محبت تجھے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے یعنی دل کی آنکھ محبوب کی برائی دیکھنے سے اندھی ہو جاتی ہے، کان اس کی ملامت سننے سے بہرے ہو جاتے ہیں۔ آنکھ پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ رہا فساد ظاہر کا بدن بیمار ہو جاتا ہے، لاغری زاری آ کر گھیرتی ہے کبھی جان بھی اس دھیان میں جاتی رہتی ہے!

کہا جاتا ہے کہ میدانِ عرفات میں ایک جوان کو سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا جو سوکھ کر لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا: "اس کا یہ حال کیسے ہوا؟" لوگوں نے کہا "اس کو عشق ہے" کہا جاتا ہے کہ سیدنا ابن عباس نے اس وقت حق تعالےٰ سے تضرّع کے ساتھ دعا کی کہ وہ ان کو اور سبھوں کو اس بلائے عشق سے اپنے امن و امان میں رکھے!

عشق بہیمی صوری کے ان مفسدات کو واضح کرنے کے بعد ابن قیم فرماتے ہیں:

عشق فی نفسہٖ نہ محمود ہے نہ مذموم، عشق کا نفع و ضرر ایک امرِ اضافی ہے۔ جو محبت عبد کو اپنے معبود و خالق سے، اس کے کمالات ذاتیہ حسن و احسان مطلق کی وجہ سے ہوتی ہے، وہ کتنی ہی زیادہ ہو سراسر نافع و محمود ہے۔ جو فرطِ محبت یا عشق مخلوق کو کسی مخلوق سے ہوتا ہے وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو مضر و حرام ہے کیونکہ کمالِ لذت و فرح سرور و نعیم قلب و بہجت روح دو امر کے تابع ہیں: جمال و کمال محبوب جس کی وجہ سے محب نے محبوب کو سب پر فضیلت دی اور اختیار کیا ہے۔ محبّ کا کمال محبت اور اس کا وصل محبوب کو ہر امر پر ترجیح دیتا ہے۔ اب ہر عقلمند یہ جانتا ہے کہ جو لذت حصولِ محبوب سے حاصل ہوتی ہے وہ قوت محبت، محبوب کی مناسبت سے ہوتی ہے، یعنی جتنی محبت زیادہ قوی ہوگی اتنی ہی یہ لذت محب کے لیے کامل ہوگی۔ اب اگر یہ لذت نفس کے لیے مطلوب ہو تو یہ مذموم ہے اور اگر یہ کسی لذتِ دائم اعظم کے لیے

مطلوب ہو، اور عیش بے کدورت کے حصول کا باعث ہو، تو ہرگز مذموم نہیں، بلکہ ہر ذی حیات کی زندگی کا مقصودِ اعلیٰ ہے، یہ لذت وہی لذتِ اُخروی اور عیشِ نعیمِ جنت ہے؛ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی سے اس کی توثیق کی گئی ہے۔ خلاقِ جلیل نے خلق کو پیدا اس لیے کیا ہے کہ وہ دارالخلد میں اس لذت کو حاصل کریں! رہی دنیا، سو اس کی لذتیں سب منقطع ہونے والی ہیں، اس کا عیش کبھی کدورت سے خالی نہیں ہوتا، یا نفسیات کی زبان میں "غیر مخلوط" عیش نہیں ہوتا، اس قسم کی غیر مخلوط، مجرد لذت خواب و سراب کے مانند ہے:

دریں دریا نظر کن مفلس و منعم یکے بینی ‌‌‌‌‌‌‌‌ گہر ہم قطرۂ آسا دیدہ دارد، پُر آب ایں جا

ع بعالم ہر کرا دیدم بدل دردِ و غمے دارد!!

پھر دُنیا کے دن کی ہے؟ یہاں اکثر لوگ تو طفلی و کم عمری ہی میں مر جاتے ہیں؛ یہ امر واقعہ ہے کہ جوان بہ نسبت بوڑھوں کے زیادہ مرتے ہیں! اور جن کی عمر پیری کو پہنچ جاتی ہے وہ آلاتِ عیش و اسبابِ لذت سے امراض و اسقام کی وجہ سے بے حظ و بے لطف ہو جاتے ہیں، ان سے متمتع ہونے کی قدرت سے محروم ہو جاتے ہیں! کسی شاعر نے اسی لیے تنبیہ کی تھی:

بآب و خاکِ جہاں دل مبند و غرہ مشو ‌‌‌‌‌‌‌‌ کہ عمر شمع، و جہاں چوں گنند گاہ باداست (صائب)

اب نعیم مقیم آخرت پر غور کرو: یہاں کا عیش دائم و قائم، خیر و ابقیٰ، پھر عیش بھی کیسا؟ دل چاہا، خالداً مخلداً، ابدالآباد تک قائم و باقی! لذت بھی کونسی؟ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی، نہ کسی دل پر اس کا خیال تک گزرا![1]

---

[1] اعددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولاخطر علی قلب بشر (حدیث قدسی مروی بخاری) یعنی: صالحین کے لیے وہ نعمت مہیا کی گئی ہے جس کو نہ کسی کان نے سنا اور نہ وہ کسی انسان کے دل میں گزری۔

اب اس عیش باقی و دائمی کو عیش فانی و پر کدورت کے حصول کی ہوس میں ہاتھ سے چھوڑنا اس کے سوا کچھ نہیں کہ سعادت ابدی کو شقاوت دائمی کے عوض مول لینا ہو۔ قرآنِ حکیم نے ببانگ دہل اعلان کیا تھا:

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ۔ (پ ۲۴ ع ۱۰)

یہ دنیوی زندگی محض متاع ہے اور ٹھیرنے کا مقام تو آخرت ہے۔

"متاع" وہ چیز ہے جس سے کوئی کام نکالا جائے، دنیا سے آخرت کا کام نکالا جاتا ہے، رہنے ٹھیرنے کا مقام تو آخرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی لذت ونعمت لذات آخرت کے حصول کا وسیلہ ہیں، لہذا دنیا کی جو لذت آخرت کی لذت کے حصول میں مُمِد و معاون ہو، فانی سے بچا کر باقی تک پہنچا دے وہ مذموم نہیں بلکہ بقدر ایصال محمود ہے، اور جو لذت دُنیوی آخرت کی لذات سے باز رکھے وہ قطعاً مذموم ہے، عشق بہیمی صوری کی لذت جو نا جائز و حرام ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

یہ ہیں ابن القیم کے افادات عشق صوری کے متعلق! یعنی جو عشق محض صورت ورنگ پر ہوتا ہے اور جس کا مقصد جماع کی لذت کا حصول ہوتا ہے، میاں بیوی کے جائز عشق ومحبت کو چھوڑ کر، عشق نہیں فسق ہے، ہوس ہے، حرام ہے، مذموم ہے، کسی طرح محمود نہیں! یہ بطالین (باطل گرویدہ) کلیل (افسردہ) کا شغل ہے، جو ہوائے نفس کی قید میں اسیر ہیں، طبیعت کے غلام ہیں، ان سے کہا جانا چاہیے کہ:

ع شاہبازی نتواں کرد بہ بالِ مگسے!

عشق مجازی کی پہلی قسم یعنی عشق بہیمی کے متعلق علمائے ظاہر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے صوفیائے کرام متفق ہیں لیکن وہ اسی چیز کو دوسرے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق مجازی جو بلا شمولِ عشق حقیقی ہوتا ہے، اور جہاں مظاہر خلقیہ و مخلوقات میں دید حق یا مشاہدۂ حق نہیں ہوتا وہ حجاب الاعظم کا باعث

ہوتا ہے، کیونکہ اس میں ہوس پرستی کا شائبہ ہوتا ہے۔ محض عشقِ مجازی کو صوفیہ "عدمِ صرف" اسی لیے کہتے ہیں کہ ان کے عرفان کی رو سے سارے ممکنات نابودِ محض ہیں اور وجودِ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، جیسا کہ شیخ اکبرؒ نے فرمایا تھا: العالم ما شمت رائحۃ الوجودِ اصلاً، پس عالم کا عشق یا عالم کی کسی چیز کا عشق حجاب اعظم ہوتا ہے اور غفلت بے حد اور تضییع اوقات! اس سے عارفین نے پناہ مانگی ہے:

نعوذُ باللہ من التفکر بعد المعرفت ومن الحجاب بعد التجلی۔	ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں عرفان کے حاصل ہو جانے کے بعد تفکر میں مبتلا ہونے سے اور تجلّی کے بعد حجاب میں آجانے سے!

صوفیہ بقول ابوبکر کتانیؒ: "عبیدُ الظاھر واحرارُ البواطن" ہوتے ہیں یعنی بظاہر بندگی و عبودیت کی راہ پر شریعتِ مطہرہ کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور باطن میں شہود و تصرفِ غیر سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ اسی لیے شیخ ابونصر شیبان بن علیؒ نے کہا تھا کہ پہلے اپنے دل کو سہو و غفلت سے اور اپنے نفس کو خواہشات ماسویٰ سے، اپنی زبان کو لغو سے مجرّد کر، اس طرح تجھے تجرید حاصل ہوگی، اب دنیا سے تعلق رکھ یا نہ رکھ دونوں تیرے لیے یکساں ہیں! دُنیا سے تعلق تجھے یافت و شہودِ حق سے غافل نہیں کر سکتا! اور یہی غفلت یا ذہول موت ہے حیات نہیں! عشقِ مجازی کی پہلی قسم یا عشقِ بہیمی کی اس قدر تفصیل کے بعد اب ہم اس کی دوسری قسم "عشقِ نفسانی" کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

عشقِ نفسانی

عشقِ نفسانی سے مراد وہ عشق ہے جو عاشق و معشوق کے جوہرِ نفس میں مشابہت ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ اکثر معشوق کے شمائل[1] یا خصائل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی خوبیٔ ترکیب، راستیٔ مزاج، حسنِ اخلاق، تناسبِ حرکات و افعال سے اور یہ شمائل معشوق کے نفس سے صادر ہوتے ہیں، اس کے برخلاف عشقِ حیوانی، جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے، شہوتِ بدنی اور طلبِ لذتِ بہیمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں زیادہ تر شیفتگی ظاہرِ معشوق اور اس کے رنگ اور اشکالِ اعضا پر ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ بدن کا کام ہے۔ عشقِ نفسانی لطافت و نفاستِ نفس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ عشقِ حیوانی نفسِ امّارہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ عشقِ نفسانی سے نفس میں وجد، حزن، بُکا، نرم دلی اور صفائیٔ فکر پیدا ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عاشق کسی باطنی شئے کا جویا ہے جو حواسِ خمسہ سے پوشیدہ ہے، اور اس کی وجہ سے وہ تعلقاتِ دنیویہ سے منقطع ہو جاتا ہے، اور ماسوائے معشوق سے اعراض کرنے لگتا ہے، اور عشقِ حیوانی میں فسق و فجور اور حرصِ فسق بڑھتی جاتی ہے، اور رغبت ایک سے دوسرے کی طرف ہوتی جاتی ہے اور ہمیشہ کشاکش جاری رہتا ہے!

اعاذنا اللہ وسائر الصالحین من شر ذالک!

چنانچہ مولانا عبدالرزاق کاشی، شرح منازل السائرین میں فرماتے ہیں:

العشق العفیف اقوی سبب	عشق پاکباز، لطیفۂ سِر کے لطیف کرنے اور عشق
فی تلطیف السر والامداد	حقیقی کے پیدا کرنے میں ایک نہایت قوی سبب کا
العشق الحقیقی لما نہ	کام دیتا ہے کیوں کہ یہ تمام غموں کو ایک غم میں مبدّل
یجعل الھموم ھما واحداً	کر دیتا ہے اور پریشانی و تفرقہ خاطر کو قطع کر دیتا
ویقطع توزّع الخاطر وتفرقہ	ہے اور محبوب کی خدمت میں لذت پیدا
وتلذذ خدمۃ المحبوب	کر دیتا ہے اور اس محبوب کی اطاعت و فرمانبرداری

[1] شمائل کے لغوی معنی عادتوں کے ہوتے ہیں، اصطلاحِ صوفیہ میں یہ جمالیات و جلالیات کے اجتماع کا نام ہے۔

وتسهيل التعب والمشقة في طاعته وامتثال امره بخلاف العشق المنبعث من غلبة سلطان الشهوة فانه وسواس ناش من تسلط الفكر في استحسان شمائل بعض الصور وغباوة النفس بالسعي في تحصيل لذاتها، واسنى هٰذين النوعين هي محل مدح العشق الصوري وذمه في كلام بعض العرفاء والحكماء۔

میں جو رنج و مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کو آسان کر دیتا ہے یہ اس عشق (یعنی عشق حیوانی) کے خلاف ہے جو غلبۂ شہوت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ عشق بعض صورتوں کی عادات و شمائل پر فکر کرنے اور ان کو پسند کرنے سے وسواس کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور نفس کی غباوت یا بے فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور عاشق و معشوق کی لذتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض عارفین اور حکماء کے کلام میں عشق صوری کی مدح و مذمت جو کی گئی ہے وہ ان ہی دو قسموں سے متعلق ہے (یعنی پہلی قسم عشق کی محمود ہے اور دوسری قسم مذموم اور دونوں کو عشق مجازی کہتے ہیں۔)

صوفیائے کرام نے عشق مجازی کی اس صنف کو یعنی عشق نفسانی کو "الطفِ اشیاء و اعطفِ عنایات کبریائی" قرار دیا ہے، کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ عشق قلب کو رقیق کرتا ہے، ذہن کو تیز کرتا ہے اور نفس کو امور شریفہ کے ادراک سے باخبر کرتا ہے۔ عارفین کا قول ہے: المجاز قنطرة الحقيقة، یعنی مجاز حقیقت کا پل ہے۔ اس عشق مجازی سے عشق حقیقی پیدا ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ عاشق معشوق کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کرتا ہے، اس توجہ سے تفکر پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ معشوق کے حسنِ شمائل و حسنِ صورت پر فکر کو مرکوز کرتا ہے اور اسی فکر سے وہ اس ذات کے عرفان تک جا پہنچتا ہے جس نے اس کے معشوق کو ظاہر و باطن کے جمال کے زیور سے سنوارا ہے۔ جب یہ عرفان عاشق کو حاصل ہو جاتا ہے تو وہ یہ جان

لیتا ہے کہ جو بھی کمال یا جمال عالم میں موجود ہے وہ اس کے خالق کے محاسن سے ہے، اس کے لیے تو ذاتی ہے اور عالم کے لیے اسی کے واسطے سے ہے، اور اس وقت وہ عارف موحد ہو جاتا ہے اور جان لیتا ہے کہ حق 'واسع' ہے یعنی کسی ایک مظہر میں مقید نہیں ہے بلکہ اس کے لیے تو جمال مطلق ہے اور وہ اس حال میں ہوتے ہوئے بھی مقید صورتوں سے ظاہر ہو رہا ہے! بس یہی نازک بات مجازی و حقیقی کے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر عارف رومیؒ نے کہا تھا:

عاشقی گرزیں سر و گر زاں سر است عاقبت ما را بداں سر رہبر است

مجازی ۱۲ — حقیقی ۱۲ — کہ عارف آیم ۱۲

یعنی عشق مجازی ہو یا حقیقی ہو بالآخر ہمیں (یعنی عارف کو) حق تعالیٰ ہی کے عشق کی طرف رہبری کرتا ہے اسی طرح عارف جامیؒ نے کہا تھا:

متاب ز عشق رو، وگرچہ مجازی ست کہ آں بہر حقیقت کارسازی ست!
بلوح اول الف با تا نخوانی بقرآں درس خواندن کے توانی؟
شنیدم شد مریدے پیش پیرے کہ باشد در سلوکش دستگیرے!
بگفت ار پا نشد در عشقت از جائے برو عاشق شو، وانگہ پیش من آئی
کہ بے جام مے صورت کشیدن نیاری جرعۂ معنے چشیدن

ایک اور طریقہ سے سمجھا یا جا سکتا ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کی طرف کس طرح رہبری کرتا ہے؛ غازی اپنے لڑکے کے ہاتھ لکڑی کی تلوار دیتا ہے تا کہ وہ اس سے مشق کرے اور جہاد کے وقت اصل تلوار استعمال کرے۔ اسی طرح عشق نفسانی جو کسی انسان سے انسان کو پیدا ہوتا ہے لکڑی کی تلوار کے مانند ہے اور یہی عشق اس وقت رحمٰن سے متعلق ہو جاتا ہے جب عاشق کسی ابتلا میں پھنس جاتا ہے۔ زلیخا ابتداء میں سالہاسال یوسف پر فریفتہ رہی بالآخر جب اس کے عشق کا تعلق خدا سے ہو گیا تو یوسف سے منہ پھیر لیا۔ شاعر کے الفاظ میں:-

غازی بدستِ پورِ خود شمشیرِ چوبیں می دہد | او بداں استا شود شمشیر گیرد در غزا
عشقے کہ بر انساں بود شمشیرِ چوبیں آں بود | آں عشق بر رحمٰں بود چوں آخر آید ابتلا،
عشقِ زلیخا سالہا بر یوسف آمد ابتدا | شد عشق او عشقِ خدا، می کرد بر یوسف قفا

کیا تم نہیں دیکھتے کہ سرکش گھوڑے کو پہلے رام کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ہی بادشاہ کی زین اس کی پیٹھ پر باندھی جاتی ہے؟

اس دلچسپ توجیہ سے قطع نظر، صوفیا کی حقیقت بیں نظر سے دیکھا جائے تو راقم الحروف کے خیال میں عشقِ حقیقی و عشقِ مجازی میں تغائرِ اعتباری کے سوا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ سبھی مستغرقِ دریائے حقیقت ہیں، سبھی کو محبوبِ حقیقی ہی سے عشق ہے، یا صوفیا کے الفاظ میں "عشق و محبت دراصل جمیلِ حقیقی کا اپنے ہی جمال کی طرف میلان کا نام ہے، خواہ مرتبۂ جمع میں ہو یا مرتبۂ تفصیل میں! اس حقیقت کو کہ سبھی اس محبوبِ حقیقی کے عشق میں مبتلا ہیں کسی عارف نے شعر کی زبان میں کس خوبی سے ادا کیا ہے:

كُلُّ الجِهاتِ لِحُسْنِ وَجْهِكَ مَشْرِقٌ | وَلِكُلِّ ذِي قَلْبٍ إِلَيْكَ تَشَوُّقُ
يَا وَاهِبَ الْحُسْنِ الْبَدِيعِ لِأَهْلِهِ | كُلٌّ بِحُسْنِكَ فِي الْحَقِيقَةِ تَعْشَقُ[1]

امام شیبانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كُلُّ الْجَمَالِ غَدًا لِوَجْهِكَ مُجْمَلًا | لَكِنَّهُ فِي الْعَالَمِينَ مُفَصَّلٌ[2]

اور کسی صاف گو نے تو صاف کہہ دیا:

نَقِّلْ فُؤَادَكَ حَيْثُ شِئْتَ مِنَ الْهَوَى | مَا الْحُبُّ إِلَّا لِلْحَبِيبِ الْأَوَّلِ!

---

[1] ہر جہت تیرے حسنِ رخ ہی سے روشن ہے، اور ہر صاحبِ دل کو ترا ہی شوق ہے۔ اے حسنِ نادر کے اس کے اہل کو عطا کرنے والے سب دراصل ترے ہی حسن کے عاشق ہیں۔

[2] کل جمال کل تیرے رُخ کی وجہ سے مجمل ہوں گے، لیکن وہ تمام عالم میں آج تفصیل سے موجود ہے۔

یعنی تو اپنے قلب کو ہوئی یعنی محبت سے جہاں چاہے گراں بار کرے، کیونکہ محبت تو صرف معشوقِ اول ہی سے ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عشقِ حقیقی عشقِ مجازی پر منحصر ہے اور واقعۃً وجودِ حقیقی وجودِ مجازی ہی کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (جیسا ہم نے بابِ چہارم میں تفصیل سے بتلایا ہے) حقیقۃ الحقائق جلت مجدہٗ کا تعین اول عشقِ مجازی و حبِّ معشوقانِ مجازی ہی کی وجہ سے ہوا ہے جس کا بیان حدیث قدسی "فاحببت ان اعرف" سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جمیلِ حقیقی کو اپنے جمال سے اس وقت بہرۂ کامل حاصل ہوا جب اس نے اپنے حسن و جمال کو مظاہر کے آئینہ میں مشاہدہ کیا۔ اور اسی لیے وجودِ مطلق نے مرتبۂ اطلاق اور غیب ہویت[1] سے تعینات کے آئینوں میں تجلّی فرمائی اور اپنے حسن کو مختلف آئینوں میں دکھایا، اور ہر آئینہ نے ایک صورتِ مناسب سے اس کو ظاہر کیا اور مظاہر کے تعدد کے مطابق کثرت[2] کا ظہور ہوا:

صد ہزار آئینہ دارد شاہد مقصود من — رو بہر آئینہ کارد جہاں درو پیدا شود

اور ظہوراتِ متنوعہ و تجلیاتِ متکثرہ سے وحدتِ ذات و کمالِ صفاتِ حق کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا، اس کو سمجھنے کے لیے نورِ آفتاب پر غور کر۔ جب وہ زمین پر پڑتا ہے تو خود اپنی ذات کی حد تک متعدد و متکثر نہیں ہوتا، جب وہ مختلف شیشوں پر پڑتا ہے تو ہر شیشہ کے رنگ کی صورت میں نمایاں ہو جاتا ہے اور نفس الامر میں تمام رنگوں سے مبرا ہوتا ہے، جب یہ قاذورات، یعنی نجس اشیاء پر پڑتا ہے تب بھی ہر نقص سے خود پاک ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام مظاہر کی صورتیں

---

[1] غیب ہویت، صوفیا کی اصطلاح میں مرتبۂ احدیت کو کہتے ہیں جس کی یافت حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتی، اس کو غیب الغیب، منقطع الاشارات بھی کہتے ہیں یعنی کنہ ذاتِ مطلق۔

[2] کثرت سے صوفیا کی مراد مخلوقات ہے۔

حق تعالیٰ ہی[1] کے نور سے نمایاں ہیں، خواہ وہ ذہنی ہوں خواہ خارجی، خواہ کامل ہوں خواہ ناقص، صوفیا کے اس کشف کی تائید کہ حق تعالیٰ ہی تمام صور مخلوقات سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ احادیث نبویہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انّ الحق یتجلی یوم القیٰمۃ للخلق فی صورۃ منکرۃ فیقول انا ربکم الاعلیٰ، فیقولون نعوذ باللہ منک، فتجلی فی صورۃ عقائدھم، فیسجدون لہ وقال ایضاً: ان الحق یتجلی یوم القیامۃ بصورۃ النقصان فینکرونھا، ثم یتحول بصورۃ الکمال فیتقبلونھا۔[2]

حق تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کے لیے صورت بد میں تجلی فرمائیں گے اور کہیں گے "میں تمہارا پروردگار ہوں" پس وہ سب کہیں گے: ہم تجھ سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں، پھر حق تعالےٰ ان کے عقائد کی صورت کے مطابق تجلی فرمائیں گے پس وہ سجدہ کریں گے۔ اسی طرح نبی صلعم نے فرمایا: روز قیامت حق تعالےٰ صورت نقصان سے تجلی کریں گے پس لوگ اس کو برا سمجھیں گے پھر وہ صورت کمال سے تجلی فرمائیں گے، اب لوگ اس کو قبول کریں گے۔

اسی طرف اشارہ ہے اس شعر میں:

در عشق خانقاہ و خرابات فرق نیست　　ہر جا کہ ہست پرتو روئے حبیب است

صوفیا کی اصطلاح میں خانقاہ سے مراد عالم تنزیہہ ہے اور خرابات سے مراد عالم تشبیہہ، مقصد یہ ہے کہ تنزیہہ ہو یا تشبیہہ دونوں کا عشق ایک چیز ہے اور دونوں

---

[1] نور اسمارِ الٰہی میں سے ایک اسم ہے، یعنی حق تعہ باسم نور تجلی ہیں یعنی اپنے اسم ظاہر سے تمام موجودات کی صورتوں سے ظاہر ہو رہے ہیں اور اسی کو نور کہتے ہیں جس سے مراد ہویدا نظاہر ہے۔

[2] تجلی کے مفہوم کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لیے دیکھو "قرآن و تصوف" باب "قرب و معیت"۔

میں یار ہی کے جمال کا پرتو ہے اور یار ہی کے جمال سے عشق کا تعلق ہے!

کسی عارف تام المعرفت سے اس نکتہ کو خوب سمجھ لینے کے بعد یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ "ثبوتِ حقیقت وجودِ مجاز پر ہے" اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سالک کے کمال عرفان کی علامت یہ ہے کہ وہ حسن مجازی میں حسن حقیقی کا مشاہدہ کرے اور "اہلِ تحقیق و توحید" کے ہاں کامل وہ کہلاتا ہے جو حق تعالیٰ کے جمال مطلق کا مظاہرِ کونی وحسی میں بچشم بصر مشاہدہ کرتا ہے جیسا کہ وہ مظاہرِ روحانی میں اس کا چشم بصیرت سے معائنہ کرتا ہے۔ "یشاھدون بالبصیرۃ الجمال المطلق المعنوی کما یعاینون بالبصر الحسن المقید الصوری"

حق تعالیٰ کے جمالِ باکمال کے دو اعتبار ہیں:

(۱) اطلاق، یہ حقیقتِ جمالِ ذاتی ہے "من حیث الذات" عارف اس اجمال کا فنافی اللہ[۱] کی حالت میں مشاہدہ کرتا ہے۔

(۲) تقیید: یہ مظاہر حسیہ وروحانیہ میں اس جمال کا ظہور یا تجلّی ہے۔

"عارف جب اپنی آنکھوں سے جمال کا مشاہدہ کرتا ہے تو جانتا ہے کہ یہ جمال حق ہے جو مراتب کونیہ میں تجلّی کر رہا ہے۔ غیر عارف، جس کو یہ نظر حاصل نہیں، اس کو ہرگز نہ چاہیے کہ حسینوں (مخلوقات) کی طرف دیکھے ورنہ وہ فتنہ آفت وخذلان میں مبتلا ہو جائے گا[۲] نفس وشہوت کا شکار بن جائے گا۔ یہ بے شک حرام ہے، کسی کو اس میں کلام نہیں: "قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" سے

---

[۱] فنافی اللہ اصطلاح صوفیا میں سالک کا اپنی خودی کو فنا و نیست کر دینا ہے۔ یہ حالت ذکر یا شغل یا تصور حق سے حاصل ہو یا اور کسی طرح سے، اور حق تعالیٰ ہی کو باقی سمجھنا ہے۔ اس حالت میں حدوث و قدم میں تمیز غائب ہو جاتی ہے۔

[۲] نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۶۲۷ و ص ۶۲۸۔

صاف طور پر تاکید کی جا رہی ہے کہ ان سے اپنی آنکھیں بند کرے۔

اکابر صوفیاء، جیسے شیخ احمد غزالی[1]، شیخ اوحد الدین کرمانی[2]، شیخ فخر الدین عراقی، قدس اللہ سرہم جو جمال مظاہر صوری حسی کے مطالعہ میں مشغول نظر آتے ہیں ان کے متعلق حسن ظن بلکہ صدقِ اعتقاد کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ وہ ان صورتوں میں حق تعالیٰ کے جمال مطلق کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، اور صورت حسی میں مقید نہ تھے!

اگر بعض اکابر نے ان کے اس کے عمل سے ناراضی کا اظہار کیا ہے تو ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ محجوب ان کے اس عمل کو اپنا دستور العمل نہ بنا لے اور اپنے حال کو ان کے حال پر قیاس نہ کرے اور نفس و طبیعت کے اسفل سافلین میں جا نہ گرے۔ واللہ اعلم باسرارہم۔

چنانچہ "رشحات" میں خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "مشائخ طریقت، قدس اللہ تعالیٰ ارواحہم، نے اپنی اصطلاحات میں لفظ شاہد (معشوق) اور مفتون بالشاہد (معشوق پر فریفتہ) کا استعمال کیا ہے۔ بعضوں نے ان کے ظاہری معنی لیے ہیں، یعنی شاہد سے مراد شاہد صوری ہے اور مفتون بالشاہد سے مراد وہ گروہ ہے جو مظاہر جمیلہ سے عشق و محبت کا رابطہ رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ نسبت مذموم ہے اور اس میں نفس کو دخل ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے کہا ہے کہ فرض کرو مشاہدہ صوری میں نفس کو کوئی دخل اور حظ نہیں رہا لیکن حظ روحانی تو باقی ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا جس طرح کہ سالک کو نفسانی

---

[1] شیخ احمد غزالیؒ کا وطن طوس ہے، آپ شیخ ابوبکر نساج کے مرید تھے اور حجۃ الاسلام امام محمد غزالی کے بھائی ہیں۔ علم ظاہر و باطن کے عالم تھے۔ وفات ۵۱۷ھ میں پائی اور آپ کی قبر قزوین میں ہے۔

لذتوں سے جو حجب ظلمانی ہیں نکل آنا ضروری ہے، اسی طرح حظوظ روحانی سے بھی جو حجب نورانی ہیں گذر جانا لازمی ہے۔[1]

راقم الحروف کی رائے میں یہ ساری پیچیدگیاں ان اکابر کے ظاہری الفاظ کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں ورنہ حقیقت میں کوئی حجاب نہیں بلکہ یہاں کشفِ حجاب کا ایک واسطہ یا ذریعہ ہمیں مل جاتا ہے۔

اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس قاعدۂ عقلیہ پر غور کرو جو تمام عقلاء کا مسلّمہ ہے اور جس کو حضرت سید محمد جعفر مکی رحمۃ اللہ علیہ، خلیفہ حضرت سلطان المشائخ شاہ نظام الدین محبوب الٰہی، قدس اللہ سرہٗ نے اپنی کتاب بحر المعانی[2] میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، کسی چیز کو محض واسطہ کی حیثیت سے دوست رکھنا اصل کی محبت و عشق کے کمال میں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتا۔ دیکھو مجنوں کو لیلیٰ سے عشق تھا، اور وہ لیلیٰ کی گلی کے کتے سے بھی محبت کرتا تھا، یہ دراصل کتے سے محبت نہ تھی بلکہ یہ عشق لیلیٰ کا محض واسطہ تھا۔ اسی طرح جب مجنوں لیلیٰ کے گھر گیا تو وہ اس گھر کا طواف کرنے لگا۔ لوگوں نے پوچھا: "تو یہ کیا کرتا ہے؟" اس نے کہا:

وما حب الدیار شغفت قلبی   ولٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدیار

اطُوفُ علی جدار دیار لیلیٰ   واقبل ذِی الجدار وَ ذا الدیار

"کسی شہر کی محبت نے میرے دل میں گھر نہیں کر لیا ہے بلکہ اس کی محبت نے دل پر چوٹ لگائی ہے جو اس شہر میں بستا ہے۔ میں لیلیٰ کے شہر کی دیوار کا طواف کرتا ہوں اور صاحب خانہ اور مالک شہر کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔"

کسی اور عاشق کا قول ہے:

---

[1] ترجمہ رشحات، مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو، ۱۸۹۳ء ص ۲۱۲۔

[2] بحر المعانی از سید محمد بن نصیر الدین جعفر مکی، مطبوعہ مطبع احتشامیہ، مراد آباد ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء۔

وللناس فی ما یعشقون مذاہب ومن مذہبی حب الدیار واہلہا

"میرے مذہب میں شہر اور اہل شہر کی محبت داخل ہے، اور بات اصل یہ ہے کہ لوگ جس سے بھی عشق کرتے ہیں اس میں ان کے طریقے جدا ہوتے ہیں۔"

ایک اور مثال پر غور کرو: اگر ایک عالم قلم، کاغذ، سیاہی، کو عزیز رکھتا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علم کا عاشق نہیں۔ محبوب لذاتہ تو صرف ایک ہی ہونا چاہیے، لیکن دوسری ان چیزوں سے محبت جو محبوب سے متعلق ہیں محبوب کی محبت میں حائل نہیں ہوتی اور نہ اس محبت کے لیے نقصان رساں ہوتی ہیں۔ اسی طرح جو شخص حق سبحانہ تعالیٰ کا عاشق ہے وہ ضرور محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھے گا اور اپنے شیخ سے بھی محبت کرے گا جو موصل الی المطلوب ہیں۔ اب غور کرو کہ کائنات میں جو چیز بھی پائی جاتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کا فعل و صُنع یا کاری گری ہے، جس چیز سے بھی تم محبت کرو گے، گویا یہ تم ان ہی کے فعل و صنع سے کرو گے۔ پس عشق و عاشق کے مقام کا کمال یہ ہے کہ ہر محبت حق تعالیٰ ہی سے محبت ہے، مجاز کا یہاں نام نہیں، جب عاشق فعل و صنعِ معشوق کو دوست رکھتا ہے تو یہ دوستی و محبت غیرِ معشوق سے دوستی و محبت نہیں ہے، کیوں کہ سب ہی ان کی مخلوقات ہیں اور ان ہی کے فعل و کاری گری کا نتیجہ ہیں۔ لہذا کسی شے کو واسطہ کی حیثیت سے عزیز رکھنا "شرکت فی المحبت" نہیں کہلائے گی اور محبوب حقیقی کی محبت کی راہ میں حجاب متصور نہ ہوگی!

یہاں پر صاحب بحر المعانی فرماتے ہیں:

"نیک فہم کنی کہ ہیچ چیز جز او نیست در ہر چہ باشی و با ہر کہ باشی"

در با دِ روئے تست کہ مستم بوئے گل
باگل مرا چہ دوستیش ہم بوئے تست

اور راز سربستہ کو فاش کرتے ہیں،

مباش احول مسمّیٰ جز یکے نیست گرچہ ما ہمہ اسماء بنہا دیم!

اب ذرا "مجاز" کے معنی پر غور کرو: مجاز مظاہر حسیہ سے قلب کے تعلق کا نام ہے، اور ان مظاہر حسیہ کے حسن سے محبت حق تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرنا ہے، کیوں کہ حسن حق تعالیٰ کی ایک عظیم الشان نعمت ہے اور قرآن حکیم میں اس عطار نعمت کا اس طرح اظہار کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِی خَلَقَکُمْ ..... وَصَوَّرَکُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَکُمْ (پ ۲۸ ع ۱۵)

وہی رب جس نے تم کو پیدا کیا .... اور تمہارا نقشہ بنایا سو خوب نقشہ بنایا۔

پس یہ آیت "صَوَّرَکُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَکُمْ" سے اس معنی کا افادہ ہوتا ہے کہ حسن صورت ایک عظیم نعمت ہے جو ہم نے تمہیں عطا کی ہے، اور اظہار عطا کے عرف عام میں دو اطلاق ہوتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ کوئی کمینہ خصلت شخص ایک چیز کسی کو دیتا ہے اور اپنے کمینہ پن کی وجہ سے ہر کس و ناکس کے سامنے بیان کرتا پھرتا ہے کہ میں نے ہی یہ نعمت فلاں شخص کو عطا کی ہے اور اس پر تکبر و فخر کا اظہار کرتا ہے۔ حق تعالےٰ کے متعلق ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ کسی شخص کے پاس نفیس چیز ایک ہوتی ہے اور وہ اپنی عنایت خاص سے یہ چیز کسی کو عطا کرتا ہے اور اس عطا کا اظہار کرتا ہے۔ اس اظہار سے دو باتیں مفہوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ اس نفیس شے کو میں نے تجھے بخشا، لیکن تو نے اس کی قدر نہ کی، اور اس کو عزیز نہ رکھا، تجھے شرم آنی چاہیے کہ تو اس حرکت سے باز آئے اور میرے عطیہ کی قدر کرے اور معطی کا شکر ادا کرے۔ دوسری بات اس اظہار سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ میرا عطیہ خاص تھا جو میں نے تجھے دیا، دوسروں

کو تو یہ خواب وخیال میں بھی میسر نہ تھا۔

حق تعالیٰ کی حکمت اس نعمت کا ذکر کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی نوعِ انسان تمام دوسری مخلوقات سے یہ امتیاز رکھتی ہے کہ ہم نے اس کو حسن صورت سے نوازا، پس اس کو چاہیے کہ اپنے تمام افعال وحرکات میں اس فضیلت کا خیال رکھے اور کوئی فعل یا حرکت اس کے خلاف نہ کرے، اور تمام نامناسب افعال سے پرہیز کرے، اور یہ حکمت بھی معلوم ہوتی ہے کہ انسان اس حسن میں حق تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرے اور اس کی خالقیت کی تصدیق کرے کہ اس نظربازی سے تصدیقِ ایمانی متفرع ہوتی ہے۔ کیونکہ مشاہدۂ جمیلہ سے ہمارا یہ اعتقاد پختہ ہوتا ہے کہ اللہ جمیل ہے اور مشاہدۂ جمال سے اس کی محبت دل میں پیدا ہوتی اور اس محبت و دلدادگی سے شکر حالی پیدا ہوتا ہے اور شکر سے بفحوائے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (پ ۱۳ ع ۱۴) اگر تم شکر کروگے تو تم کو زیادہ نعمت دوں گا۔

محبت و گرویدگی میں اضافہ ہوتا ہے جس جمیل سے بھی ربط ہوگا اس کے جمال کو جمیل مطلق ہی کے آثار میں سے ایک اثر سمجھا جائے گا اور اسی حسین مطلق کی تعظیم پر قلب مائل ہوگا جو اپنی تجلی اس صورت میں کر رہا ہے، اور خود اس حسن مقید کی تعظیم شعائر اللہ کی تعظیم ہوگی:

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا جو شخص خدا کی یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے تو اس کا
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (پ ۱۷ ع ۱۱) یہ لحاظ رکھنا تقوئ قلب سے ہوتا ہے۔

اس معنی میں "صورتوں سے عشق خود مصور سے عشق" قرار دیا جاتا ہے اور یہی صوفیا کے نزدیک محقق ہے۔

چنانچہ بعض عارفین کا قول ہے: "ان محبۃ اللہ للخلق عائدۃ الیہ حقیقۃ" یعنی خلق کے ساتھ خدا کی محبت درحقیقت اسی کی طرف عود کرتی ہے

لیکن نظرِ ظاہر میں خلق کی خلق کے ساتھ محبت معلوم ہوتی ہے، اور اس تعلق کے مطابق خاص و عام سے اس کا ظہور ہوتا ہے یعنی محبت کے آثار و علامات ان کی استعداد کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دراصل محبت محب و محبوب ایک ہیں، محبتِ صفاتیہ محبت ذاتیہ سے صادر ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ (پ ۶ ع ۱۲) یعنی ان سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے، کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے محبت نہ کی، پس ان کی اللہ تعالیٰ سے محبت اللہ تعالیٰ کی ان سے محبت کی وجہ سے ہوئی اور یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت ازل سے ہے، بغیر کسی علت کے۔ جب حق تعالیٰ نے ان کو پشت آدم سے نکالا اور ان کے قلوب پر حق تعالیٰ کی محبت متجلی ہوئی اور ان کو اپنی طرف جذب کیا تو بعض کو اس کا علم ہوا اور بعض کو علم نہیں ہوا، اب جس کسی نے یہ جانا اور مبدءِ اول کی محبت تک رسائی کی یعنی اس کے آثار اور اسماء و صفات کے مبادی پر متوقف نہیں ہوا وہ کامل و مکمل ہے، جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (پ ۲۷ ع ۵) یعنی نگاہ تو نہ ہٹی، نہ بڑھی، اور جو اس کو مرتبۂ اسماء و صفات و افعال و آثار کی حد تک جانا اور وہیں متوقف ہو گیا، وہ اس مرتبۂ اولیٰ سے کم ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ان دو مراتب کے سوا محجوبین کا مرتبہ ہے جو اپنا مقام اسم ظاہر و باطن کی تجلیات میں نہیں جانتے۔ یہ عارف کا مقام نہیں جو حق اور اس کے جمال کا مظاہر خلقیہ یعنی مخلوقات میں مشاہدہ کرتا ہے۔

اسی طرف اشارہ ہے شاہ تراب نے کہا:

التفاتم سوئے خوباں نیست بے وجہے تراب ٭ در رخ ایشاں ہمی بینم تماشائے دگر!

شیخ اکبر قدس اللہ سرہ نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے:

"العالم خلقه الله فی غایة الاحکام والاتقان کما قال الامام ابوحامد الغزالی "لیس فی الامکان ابدع من هذا العالم" فاخبر انه خلق آدم علی صورته، والانسان مجموع العالم، ولم یکن علمه بالعالم الاعلمه بنفسه اذلم یکن فی الوجود الاهو وفعله، فلابد ان یکون علی صورته، فلما اظهره فی عینه کان مجلاه، فما رای فیه الاجماله فاحب الجمال، فالعالم جمال الله فهو الجمیل، المحب للجمال، فمن احب العالم بهذا النظر فما احب الاجمال الله وصورة جماله"

اللہ تعالیٰ نے عالم کو نہایت استوار اور مضبوط پیدا کیا ہے، جیسا کہ امام ابو حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، "امکان میں اس عالم سے زیادہ کوئی شے نادر نہیں"، اور اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور انسان مجموعۂ عالم ہے اور اللہ تعالیٰ کو عالم کا جو علم ہے وہ اپنی ذات ہی کا تو علم ہے، کیوں کہ وجود اس کے اور اس کے فعل کے سوا کسی شے کا نہیں، پس ضروری ہے کہ آدم اس کی صورت پر ہو، پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی عالم کے عین ثابتہ پر کی تو بعین اس کا مجلی یا تجلی گاہ بن گیا، پس عالم جمال اللہ ہے اور اللہ اپنے ہی جمال کا محب ہے، اب جو عالم کو اس نظر سے محبوب رکھتا ہے وہ جمالِ حق اور اس کی صورتِ جمال ہی کو محبوب رکھتا ہے۔

عالم تمام جلوہ گاہِ دلبرِ من است ۔۔۔ ہر جا کہ دل کشود نظر، او دو چار شد!

محقق قیصری نے نظم السلوک کی شرح کے مقدمے میں لکھا ہے:

"المحبة میل الجمیل الی الجمال ۔۔۔ محبت جمیل کا جمال کی طرف میلان ہے جو شاید

بدلالة المشاهدة كما ورد:
"ان الله جميل ويحب الجمال"
وذالك لأن كل شئ ينجذب
الى جنسه واصله فانجذاب
الى جمال المحبوب ليس الا
لجمال فيه والجمال الحقيقي
صفة ازلية لله سبحانهٗ
بمشاهدة فى ذاته اولاً مشاهدةً
علمية فاراد ان يراه فى صفة
مشاهدة عينية، فخلق
العالم كمرأة شاهد فيه عين
جماله عيانا وقوله صلى الله
عليه وسلم حكايةً عن الله
تعالى: "كنت كنزاً مخفيا فاحببت
ان اعرف فخلقت الخلق اشارة
الى هذا المعنى فالجمال الحقيقي
هو الله وكل جميل فى الكون
مظهر جماله ولما خلق الله
الانسان على صورته جميلاً و
بصيراً فكلما شاهد جميلاً
انجذب اليه احداً ان بصيرة

کی رہنمائی سے ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں
آیا ہے: "اللہ جمیل ہے اور جمال کو چاہتا ہے"
اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شے اپنی جنس اور
اصل کی طرف منجذب ہوتی ہے. پس،
جمال محبوب کی طرف محب کی کشش
اس جمال ہی کی وجہ سے ہوتی ہے جو
محبوب میں پایا جاتا ہے اور جمال حقیقی
حق سبحانہٗ تعالیٰ کی ایک ازلی صفت ہے
بسبب اس مشاہدہ کے جو وہ اپنی ذات
کا کرتا ہے جو اولاً مشاہدۂ علمیہ کے طور پر
ہوتا ہے، اس نے چاہا کہ اس کا خارج میں
مشاہدہ کرے، پس اس نے عالم کو پیدا کیا
جو ایک آئینہ کے مانند ہے جس میں اس نے
اپنی آنکھ سے اپنے جمال کا مشاہدہ کیا، اور
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ قول جو بطور
حکایت قول الٰہی ہے: "میں ایک گنج مخفی
تھا، میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں تو میں
نے خلق کو پیدا کیا" اسی مفہوم کی طرف
اشارہ کرتا ہے. پس جمال حقیقی حق تعالیٰ ہی
ہیں اور عالم میں جو بھی جمیل ہے اسی کے جمال
کا مظہر ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو

وامتد نحوه اعشاق سريته، فظهر من هذا ان كما ان الله عشق كذالك العالم ايضاً ولا وجود والشئ الا لهٗ!"

کو اپنی صورت پر جمیل و لطیف پیدا کیا ہے اس لیے جب انسان کسی جمیل کو دیکھتا ہے تو اس کی آنکھ کی پتلی اس طرف مائل ہوتی ہے اور اس کے قلب کی توجہ اسی طرف جذب ہوتی ہے۔ پس اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ عاشق ہے اسی طرح عالم بھی عاشق ہے اور سوائے حق تعالیٰ کے وجود کسی کا نہیں!

اللہ اللہ، اللہ: اللہ: ظاہر کہ باطن، اول کہ آخر (امیر)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق ایک شے لطیف و امر لطیف ہے کوئی شے اس کی مانند نہیں اور اس کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ ہے کہ عشاق مطلق ہو جاتے ہیں اور اطلاق کا اقتضا یہ ہے کہ وہ کسی شے میں مقید نہیں ہوتے یعنی اسی پر توقف نہیں کرتے اور اسی وجہ سے عارفین کے ہاں عاشق عاصی یا گنہگار نہیں سمجھا جاتا، مشائخ کرام سے کسی شیخ عارف کا قول ہے کہ یہ عشق کی کرامت ہے کہ عاشق ملامت کا مستوجب نہیں ہوتا اور اس گناہ پر عذاب و عقوبت کا مستحق نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا درد اضطراری ہوتا ہے اور اس کا جرم غیر اختیاری وہ محلِ رحمت ہوتا ہے اور مظہر فضل و مغفرت:

ہر کرا سوخت آتشِ عشقے | طالعش سعد و فال فیروز است
نالۂ عاشقانِ محنت کش | مشعلِ آتشِ گنہ سوز است!

حق تو یہ ہے کہ بغیر عشق کے اس بات کا امکان نہیں کہ انسان کی رسائی حقیقت تک ہو۔ حقیقت مجاز پر موقوف ہے، اور یہ بات تو بدیہیات سے ہے کہ احکام الٰہی کی معرفت ارسال رسل کے بغیر ممکن نہیں تھی، ان ہی رسولوں کے توسط سے ہمیں ان احکام کا علم ہوا، اور ہم دولتِ ایمان سے

مشرف ہوئے، دخولِ جنت کے قابل اور دوزخ سے خروج کے مستحق ہوئے۔
اسی طرح عشقِ مجازی ہی ہمیں عشقِ حقیقی تک رہنمائی کرتا ہے، حقیقت سے مانوس کرتا ہے۔ عشقِ مجازی کے بغیر عشقِ حقیقی تک رسائی نہایت دشوار ہے!

یہاں ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ اولیاء اکثر صورِ جمیلہ کے عشق میں مبتلا ہوئے ہیں اور فرمایا ہے:

نقّل فؤادك حيث شئت من الهوى
ما الحبّ الا للحبيب الأوّل

شیخ اکبر قدس اللہ سرہٗ نے فتوحات کے باب ۱۷۷ میں لکھا ہے کہ شیخ روزبہان بقلیؒ[1] (وفات ۶۰۶ھ) مکہ میں کسی عورت پر عاشق ہوگئے۔ حرم میں صوفیا کے یہاں گئے اور اپنا خرقہ اتار کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس حال کے ختم ہونے پر اپنا خرقہ پہن لیا۔

عاشقان را شادمانی و غم اوست — مزدِ کار و اجرتِ خدمت ہم اوست
غیرِ معشوق ار تماشائی بود — عشق نبود، ہرزہ سودائی بود

شیخ نجم الدین کبریؒ[2] قدس سرہٗ نے اپنے حالات میں لکھا ہے:۔

---

[1] حضرت شیخ روزبہان بقلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خضرؑ کے ہم صحبت تھے، شیراز ان کا وطن تھا، (۶۰) سال تک سوائے نماز جمعہ اور کفایت مہمات کی غرض کے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ (سفینۃ الاولیاء ص۱۲۶)

[2] آپ کی کنیت ابوالجناب ہے اور نام احمد بن عمر خیوقی اور لقب کبریٰ۔ آپ کو کبریٰ اس لیے کہا گیا ہے کہ ایام جوانی میں، جب آپ تحصیل علم میں مشغول تھے، جس سے مناظرہ ومباحثہ کرتے غالب آتے۔ اس لیے آپ کا لقب "طامۃ الکبریٰ" رکھا گیا، جس کے معنے بڑی بلا کے ہیں۔ اس کے بعد طامۃ کا لفظ حذف ہوگیا اور کبریٰ رہ گیا، امام یافعی کی تاریخ میں آپ کے لقب کی یہی وجہ بتلائی گئی ہے۔ آپ کو "شیخ ولی تراش" بھی کہتے تھے (باقی صفحہ ۱۸۵ پر)

عشقت جارية بقرية على	ملک مصر میں دریائے نیل کے کنارے ایک گاؤں
ساحل نيل بمصر فبقيت اياما	ہے وہاں میں ایک عورت پر عاشق ہو گیا، بہت
لا آكل ولا اشرب الا ما شاء الله	دنوں تک یہی حالت رہی کھانا پینا چھوٹ گیا،
حتى كثرت نار العشق، فكنت	آتش عشق نے یہاں تک غلبہ کیا کہ میری سانس
اتنفس نيرانا وكلما تنفست	سے آگ نکلنے لگی، جب میری سانس سے آگ
ثم نارا ابتنى من السماء	نکلتی تو آسمان سے بھی ایک آگ میری سانس
بحذاء نفسي نارا فيلتقي	کے بالمقابل نکلتی اور یہ دونوں میرے اور
ناران ما بيني وبين السماء	آسمان کے درمیان مل جاتیں، میں یہ نہیں
فما كنت ادري من اين يلتقيان	سمجھتا کہ یہ دونوں کہاں سے مل جاتی ہیں،
فعلمت ان ذالك شاهدي	پس میں نے جان لیا کہ یہ میرا معشوق ہے
في السماء۔	آسمان میں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) اس لیے کہ وجدی حالت میں جب پر آپ کی نظر پڑ جاتی وہ درجۂ ولایت تک پہنچ جاتا، کہتے ہیں کہ ایک سوداگر آپ کی خانقاہ میں آیا، اس وقت شیخ کی حالت بہت قوی تھی، آپ کی نظر اس پر جا پڑی اسی وقت وہ مرتبہ ولایت تک پہنچ گیا، آپ نے اس کو اجازت ارشاد عطا کی اور فرمایا کہ اپنے ملک کو واپس ہو کر خلق کو خدا کی طرف بلائے، ایک دن شیخ اپنے مریدوں میں تشریف فرما تھے کہ ایک باز نے ایک ممولے کا پیچھا کیا، اتفاقاً آپ کی نگاہ ممولے پر پڑ گئی تو ممولا پلٹ پڑا اور باز کو پکڑ کر آپ کے سامنے لایا، ایک روز آپ خانقاہ کے دروازے پر کھڑے تھے کہ ایک کتا آپ کے سامنے آگیا اور اپنی دم ہلانے لگا آپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ کتا متحیر و بے خود ہو گیا اور قبرستان کی راہ لی اور زمین پر سر ملتا تھا۔ وہ جدھر جاتا شہر کے سارے کتے اس کے اطراف جمع ہو جاتے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ لیتے اور آوازے نہ بولتے۔ کچھ دن بعد وہ کتا مر گیا۔ شیخ نے اس کو دفن کر دیا...... مولانا روم نے فرمایا تھا

یک نظر فرما کہ مستغنی شوم زا ہنائے جنس — سگ کہ شد منظور نجم الدین سگاں را سرور است

آپ طریقت و تصوف میں یگانہ و بے نظیر ہیں اور آپ کے خوارق و کرامات تمام عالم میں مشہور ہیں۔ آپ کی نسبت ارادت دو طرف تھی۔ ایک شیخ عمار یاسر سے اور دوسری شیخ اسمٰعیل قصری سے شیخ روزبہان سے بھی آپ نے فیض حاصل کیا ہے، آپ کی شہادت تاتاریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ۶۱۸ھ میں واقع ہوئی، مزید حالات کے لیے دیکھو نفحات الانس اردو ترجمہ صـ ۴۴۸ تا ۴۵۳ھ)

شیخ فخرالدین عراقی نے ان اشعار میں اسی طرف اشارہ کیا ہے؛

قبلۂ عاشقانِ وجہ اللہ — نجم دیں آں زسرِ عشق آگاہ
گفت در قریہ بساحلِ نیل — شد دو چارم زنے بوجہ جمیل
تیرِ عشقش بسینہ ام جاکرد — ظاہر و باطنم شدہ ہمہ درد
روزہا در ہوائے آں خود کام (اے معشوقہ) — منقطع بودم از شراب و طعام
آتشِ عشق (خواہش) تا زبانہ کشید — شعلۂ آہ من بچرخ رسید
نفسم بود آتشے (چنگاری) محبوس — کہ کند ہفت دوزخش پابوس
آتشے کز دلم کشیدے سر — التفاتش شدے بنارِ دگر
بودے آں آتش دگر بفلک — کہ کند نقش ما سوی راچک (محو)
نیست بر حالِ ایں چنیں کامل — وجہ انکارِ ناقص و جاہل!

سچ کہا ہے کسی عارف نے:

ہر دل کہ بسوئے دلبرے مائل نیست — او را ز حیات بہرۂ حاصل نیست
رندے کہ خبر ز سرِ ہستی دارد — ہر گز نفسے ز عاشقی (حصہ) غافل نیست

کسی اور عاشق کا بیان ہے:

تا من ز لبِ لعل[1] تو ذوقے دارم — پیوستہ بدل آتشِ شوقے[2] دارم
تا زلفِ تو حلقہ حلقہ ظاہر شدہ است — در گردنِ جانِ خویش طوقے دارم

ان ہی شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے لکھا ہے:

عشقت واحد ابناء العرب، ایک بار عرب کے کسی شہر میں کسی پر عاشق

---

[1] لب اصطلاحِ صوفیا میں کلامِ معشوق کو کہتے ہیں اور "لب لعل" عاشق کے کلام کے بطون کو کہتے ہیں۔

[2] شوق اصطلاحِ صوفیا میں کشش حقانی کا نام ہے جس سے سالک کی خودی فنا ہو جاتی ہے اور اس سے مراد سالک کا حق تعالیٰ کی طرف بکمال جوش بڑھنا اور تمام اشیا سے منقطع ہو جانا ہے۔

فسلطتُ عليه نهمة فأخذته
وربطته ومنعته من سواي،
إلا أنه كان عليه رقباء فسكت
عن صريح المقال وجعل يكلمني
بلسان الحال، فأفهمه وأكلمه
كذلك، فيفهمه، وانتهى
الأمر إلى أن صرتُ أنا هو وهو أنا،
ووقع العشق إلى محض صفاء
الروح، فجاءتني روحه سحرًا
تمرغ وجهها في التراب ويقول
أيها الشيخ، الأمان الأمان!
قتلتني، أدركني، فقلت ماذا
تريد؟ قالت أن تدعني
حتى أقبل قدميك، فأذنت
لها، ففعلت ذلك، ورفعت
وجهها، فقبلتها، حتى استراحت
واطمأنت إلى صدري"

ہوگیا، میں نے اس پر اپنی ہمت مسلّط
کردی اس کو میں نے پکڑا اور اپنی ذات
سے باندھ دیا، اور اپنے سوا ہر کسی سے
منع کردیا، لیکن اس کے چند نگہبان
تھے اس لیے وہ صاف صاف گفتگو
نہ کرسکتا تھا، زبان حال سے اس نے
گفتگو کی، میں اس کو سمجھتا تھا اور اس سے
اسی طرح گفتگو کرتا تھا اور وہ اس کو سمجھتا،
کام انتہا کو پہنچا یہاں تک کہ میں وہ ہوگیا
اور وہ میں ہوگیا اور عشق محض صفائی روح
تک پہنچ گیا۔ ایک رات اسکی روح پراگندہ حال میرے
پاس آئی اور کہنے لگی: اے شیخ میں تجھ سے
پناہ مانگتی ہوں، تو نے مجھے قتل ہی کرڈالا،
بس میری فریاد کو پہنچ! میں نے پوچھا: "تو کیا
چاہتی ہے؟ کہا مجھے اجازت دے کہ میں
قدم چوموں" میں نے اجازت دی، اس نے
میرے قدم چومے، اور اپنا منہ اٹھایا،
میں نے اس کو بوسہ دیا یہاں تک کہ اس کو
راحت واطمینان ہوا اور اس نے میرے
قلب سے معانقہ کیا۔

تا من رہ عشق دیدم وراہ رواں ۔۔۔ باشد دل وجان من دراں راہ رواں

رونده ۱۲

خواہم لب خشک و چشم تر در رہِ عشق   زانرو کہ بود نشانۂ راہ رواں

عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعۂ عشق اس طرح نظم کیا ہے:

اے ز عشاق گرم بازارت   عالمے بہ زمن (بہ قیمت ۱۲) خریدارت
من کیم تا زنم ز عشق تو لاف (دعویٰ)   نیست با دعوے ایں سخن بگزاف
یکے از عاشقان جمال ترا   بود نجم اکابر (بزرگان ۱۲) کبرا (وفضول ۱۲)
آں معین (مددگار) شریعت احمدؐ   آں قتیل دل و قریب احد
بود او برج انجم اخیار   آفتاب معانی و اسرار
گفتہ اند کہ سالکان رہ بردند   اقتباس کمال ازو کردند
بربود از مقام آزادی   دل او حسن مجد بغدادیؔ[ل]
بربودش بتے چناں مقبل   ناگہاں از مقام عالی دل
حسن زیباش چوں خیل (گروہ) عشق آورد   صبر و آرام او بغارت برد
گفت یاراں بر من آریدش   ہست جاں سوئے او تن آریدش
زو بپرسید تا چہ دارد دوست   واں چہ باشد کہ دوست عاشق اوست
درویشش چوں ازو بپرسیدند   میل شطرنج باختن دیدند
شیخ شطرنج خواست و وقت گزید   با حریف ظریف می بازید
چونکہ مغلوب کرد خیلش را   ہمگی (تمام ۱۲) جذب کرد میلش را
حب شطرنج از دلش بربود   بازیٔ چند بس نکوش نمود

ل اشارہ ہے حضرت شیخ مجد الدین بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف۔ آپ کا نام شرف بن المؤید بن ابوالفتح تھا، وطن بغداد، حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کے مرید تھے۔ ان پر شیخ کی بہت توجہ تھی اور اسی توجہ کی برکت سے مقامات عالیہ تک ان کی رسائی ہوئی ...... وفات سنہ ۶۰۶ھ یا دوسری روایت کی رو سے ۶۱۸ھ میں ہوئی اور آپ کا مزار اسفرائین میں ہے۔

چند روزے بخلوتش بنشاند کاندراں لوح مہر عشق بخواند
چوں ز ذوق صفاش بیہش کرد ہمہ در عشق او فرامش کرد
ہست عشق آتشے کہ شعلۂ آں سوزد از دل حجاب ہر حدثان
چوں بسوزد ہمہ اے بیجا ہیچ او بماند جدا و نماند ہیچ!

عشق را وصاف کردگار یکیست
عاشق و عشق و حسن یار یکیست

نفحات الانس میں شیخ فخر الدین عراقی کے حالات میں لکھا ہے:

"معین الدین پروانہ، جو روم کے امرا میں سے تھا، شیخ عراقی کا معتقد و مرید تھا، شیخ کے لیے خانقاہ بنائی اور ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایک دن خدمت میں حاضر ہوا اور ساتھ نذرانہ کے لیے رقم لیتا آیا، اور نہایت عاجزی سے عرض کی: "شیخ ہم سے کوئی خدمت کیوں نہیں لیتے اور ہماری طرف التفات کیوں نہیں فرماتے؟" شیخ نے ہنس کر کہا: "اے امیر! تم ہمیں نذرانہ دے کر فریفتہ نہیں کر سکتے، اپنے کسی آدمی کو بھیجو اور حسن قوال کو ہمارے ہاں پہنچاؤ!" یہ حسن قوال جمال دلپذیر اور حسن بے نظیر رکھتا تھا، بہت لوگ اس کے عشق میں گرفتار تھے۔ جب امیر نے شیخ کی یہ تمنا دیکھی تو کسی شخص کو اس کے بلانے کے لیے بھیجا۔ عاشقوں کے شور و غوغا اور ان کی مزاحمت دور ہونے کے بعد حسن کو شیخ کی خدمت میں پہنچایا گیا۔ شیخ نے امیر اور دوسرے اکابر کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ جب اس سے قریب ہوئے تو اس کو سلام کیا، اور بغل گیر ہوئے۔ پھر شربت منگوایا اور اس کو اور اس کے دوستوں کو اپنے ہاتھ سے پلایا۔ اس کے بعد آپ اس کے ساتھ خانقاہ تشریف لے گئے، مجلس جمی، سماع ہوا۔ شیخ نے اس وقت غزلیں کہیں، ان میں سے ایک غزل یہ بھی ہے:

سازِ طرب عشق کہ داند کہ چہ سازاست   کز زخمہ او نہ فلک اندر تگ و تاز است (الخ)

اس کے بعد حسن قوال نے اجازت مانگی اور اپنے مقام کو واپس ہوا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن امیر معین الدین میدان کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھا کہ حضرت شیخ بلّا ہاتھ میں لیے لڑکوں کے درمیان کھڑے ہیں، امیر نے شیخ سے پوچھا: "ہم کس طرف ہوں گے؟" شیخ نے کہا: "اس طرف" اور اشارہ راستے کی طرف کیا۔ امیر وہاں سے چل دیا۔

جب امیر معین الدین نے وفات پائی تو شیخ روم سے مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کی ملاقات سلطانِ مصر سے ہوئی، جو اُن کا مُرید ہو گیا اور ان کو مصر کے شیخ الشیوخ کے عہدہ پر فائز کیا۔ لیکن اس کے باوجود آپ بے تکلف بازاروں میں پھرتے تھے۔ ایک روز موچیوں کے بازار سے گزرے، وہاں آپ کی نظر ایک موچی کے لڑکے پر پڑی اور اس پر عاشق ہو گئے۔ اس کے سامنے جا کر سلام کیا، اور موچی سے پوچھا کہ یہ کس کا لڑکا ہے؟ اس نے کہا: "میرا لڑکا ہے" شیخ نے لڑکے کے لبوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "کیا یہ ظلم نہیں کہ ایسے لب اور دانت گدھے کے چمڑے سے لگیں؟" موچی نے عرض کی: "ہم غریب لوگ ہیں اور یہ ہمارا پیشہ ہے۔ اگر ہم گدھے کے چمڑوں کو دانتوں سے نہ پکڑیں تو ہمیں روٹی کہاں سے ملے گی؟" شیخ نے پوچھا: "یہ لڑکا ہر روز کس قدر کام کرتا ہے؟" کہا: "ہر روز چار درم کماتا ہے" شیخ نے کہا: "میں ہر روز آٹھ درم دوں گا، اس سے یہ کام نہ لیا جائے" شیخ ہر روز وہاں جاتے اور اپنے مریدوں کے ساتھ موچی کی دکان پر بیٹھتے اور فراغت خاطر کے ساتھ اس لڑکے کو دیکھتے اور شعر پڑھتے اور روتے۔ مخالفین نے یہ خبر سلطان تک پہنچا دی۔ اس نے ان سے پوچھا: "کیا شیخ اس لڑکے کو رات یا دن اپنے ساتھ لے جاتے ہیں؟" کہا نہیں، پھر

پوچھا: "کیا دکان میں کبھی اس کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں؟" کہا "نہیں" اس نے قلم دوات منگوائی اور حکم دیا کہ شیخ کے وظیفہ میں روزانہ مزید پانچ دینار کا اضافہ کیا جائے۔ دوسرے دن جب شیخ کی سلطان سے ملاقات ہوئی تو سلطان نے کہا: "میں نے سُنا ہے کہ شیخ کی نگاہ موچی کے لڑکے پر پڑی ہے، اور میں نے خرچ کے لیے تھوڑی سی رقم زیادہ کردی ہے، اگر شیخ چاہیں تو اس لڑکے کو خانقاہ میں لے جا سکتے ہیں"۔ شیخ نے جواب دیا: "ہمیں اس کا فرماں بردار رہنا چاہیے، اس پر حکم نہیں چلایا جا سکتا"۔

چند روز بعد شیخ نے مصر سے شام کا ارادہ کیا۔ سلطانِ مصر نے شام کے ملک الامراء کو لکھا کہ وہ تمام علماء، مشائخین اور ارکانِ دولت کے ساتھ شیخ کا استقبال کرے۔ چنانچہ شیخ کا اسی شان سے استقبال کیا گیا۔ ملک الامراء کا ایک لڑکا نہایت حسین تھا۔ شیخ کی نظر جب اس پر پڑی تو بے اختیار اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ لڑکے نے بھی اپنا سر شیخ کے قدموں پر رکھ دیا اور ملک الامراء نے بھی اپنے لڑکے کے ساتھ موافقت کی[1]۔"

اسی کتاب میں شیخ احمد الدین کرمانی، قدس اللہ تعالیٰ سرہ کے حالات میں لکھا ہے: "جب آپ سماع میں گرم ہوتے تو امردوں کے پیراہن چاک کر دیتے اور اپنا سینہ ان کے سینہ پر رکھ دیتے۔ جب آپ بغداد (طفلان بے ریش و بد وضع) پہنچے تو خلیفۂ وقت کا لڑکا، جو نہایت حسین و جمیل تھا، آپ کے متعلق یہ خبر سن کر کہا کہ یہ شخص بدعتی ہے یا کافر اگر میری مجلس میں یہ حرکت کرے تو میں اس کا قصہ ہی ختم کر دوں، سماع کی ایک محفل میں یہ لڑکا بھی موجود تھا۔ شیخ نے اپنے کشف سے اس کا یہ خطرہ معلوم کر لیا اور اس سے مخاطب ہو کر یہ رباعی پڑھی:

---

[1] نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۶۳۹ و ص ۶۴۰۔

سہل است مرا بر سر خنجر بودن ۔۔۔ در پائے مراد دوست بے سر بودن
تو آمدہ کہ کافرے را بکشی ۔۔۔ غازی چو توئی، رواست کافر بودن

خلیفہ کے لڑکے نے اپنا سر شیخ کے پاؤں پر رکھ دیا اور آپ کا مرید ہو گیا۔

جامیؒ اس واقعہ کو نقل کر کے تبصرۃً فرماتے ہیں کہ اہل توحید کے نزدیک کامل و مکمل وہ فرد ہوتا ہے جو حق سبحانہٗ کا جمال مطلق مظاہر حسی میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے، لیکن وہ کسی صورت جمیل میں مقید نہیں ہو جاتا۔ کسی خاص صورت سے تعلق و میلان کا ہونا فتنہ، حرمان، آفت و رسوائی کے دروازوں کے کھلنے کا باعث ہوتا ہے۔ اکابر جو مظاہر صوری حسی کے جمال کے مشاہدہ میں مشغول رہتے ہیں، ان کے متعلق ہمیں یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ یہاں حق سبحانہ کے جمال مطلق ہی کا مشاہدہ کیا کرتے تھے:

چنانچہ شیخ اوحد الدین کرمانی اپنی مثنوی مصباح الارواح کے آخر میں فرماتے ہیں:

تا جنبش دست ہست با دام ۔۔۔ سایہ متحرک است ناکام
چوں سایہ ز دست یافت مایہ ۔۔۔ پس نیست خود اندر اصل سایہ
چیزے کہ وجود داد بخود نیست ۔۔۔ ہستیش نام نہادن از خرد نیست
ہست است و لیک ہست مطلق ۔۔۔ نزدیک حکیم نیست جز حق
ہستی کہ بجز تو نام دارد ۔۔۔ او نیست ولیکن نام دارد
ہر نقش خود است فتنہ نقاش ۔۔۔ کس نیست در یں میاں تو خوش باش
خود گفت حقیقت و خود شنید ۔۔۔ واں روئے کہ خود نمود خود دید

پس باد یقین کہ نیست واللہ
موجود حقیقی سوائے اللہ

ل نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۶۲۷ و ص ۶۲۸

جامیؒ نے اپنی اس کتابؒ میں "رسالہ اقبالیہ" سے نقل کیا ہے کہ شیخ رکن الدین علاؤالدولہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جس روز قافلہ منیٰ میں تھا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کا ایک مرید بھی وہاں تھا۔ ہم لوگ ان کی زیارت کو گئے۔ ہم نے ان سے پوچھا: "سنا جاتا ہے کہ شیخ سہروردی اوحدالدین کرمانی کو بدعتی کہا کرتے تھے اور اپنے پاس آنے نہیں دیا کرتے تھے، کیا یہ بات سچ ہے؟" انھوں نے کہا: "ہاں سچ ہے۔ میں ایک روز شیخ کی خدمت میں حاضر تھا، کسی نے شیخ اوحدالدین کرمانی کا ذکر کیا، فرمایا کہ میرے سامنے اس کا نام نہ لو، وہ بدعتی ہے۔ دوسرے دن بھی میں شیخ کی خدمت میں موجود تھا، کسی نے ان سے کہا کہ شیخ اوحدالدین نے آپ کی یہ بات سن کر کہا: "اگرچہ مجھ کو بدعتی کہا ہے مجھ کو یہی فخر کافی ہے کہ میرا نام شیخ کی زبان پر گزرا اور یہ شعر پڑھا:

ماساءنی ذکرک بمساءۃ ٭ بل سرلی انی خطرت ببالک

یعنی "تمہارا مجھ کو برائی سے یاد کرنا ناگوار نہیں گزرا، بلکہ میں خوش ہوا کہ تمہارے دل میں میرا خیال تو گزرا"

شیخ سہروردی نے یہ سن کر ان کے حسنِ خلق کی تعریف فرمائی۔

شیخ سہروردی نے ان کو جو بدعتی کہا ممکن ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ وہ حقیقت کے شہود میں مظاہر صوری سے توسل کرتے تھے، اور جمال مطلق کا مشاہدہ مقیدات کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ شیخ شمس الدین تبریزیؒ نے ان سے پوچھا: "تم کس کام میں لگے ہوئے ہو؟" کہا: "ماہ را در طشت آب می بینم" فرمایا "اگر بر قفا دنبل نداری چرا بر آسمانش نمی بینی؟" یعنی اگر تمہارے سر کے پیچھے پھوڑا نہیں ہے تو کیوں اس کو آسمان پر نہیں دیکھتے؟" مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ

نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۶۲۶ و ص ۶۲۷

سے لوگوں نے کہا: اوحد الدین شاہد پرست ہیں، لیکن پاکباز ہیں" مولانا نے فرمایا: "کاش کردے و گزشتے" یعنی عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک پہنچ جاتے شیخ کرمانی کی یہ رباعی ان کے سلوک کی وضاحت کرتی ہے:

زاں می نگرم بچشمِ سر در صورت ‏ ‏ زیرا کہ ز معنی است اثر در صورت
ایں عالم صورتست و ما در صوریم ‏ ‏ معنی نتواں دید مگر در صورت

یعنی صفتِ جمالِ الٰہی کی تجلی صورت ہی میں ہوتی ہے اس لیے صورت یا نقش نظر ضروری ہے، جیسے کسی عارف نے کہا تھا:

معنی نہ بخویش آشکارا ست ‏ ‏ در پردۂ صورت ایں نظار است
چوں مطلعِ حسن ہست صورت ‏ ‏ بر بت نکنم نظر ضرورت

جامی سامیؒ نے اپنے عشق کی کچھ وارداتوں کا ذکر اپنی کتاب "بہارستانِ جامیؒ" میں کیا ہے۔ اس قسم کے قصے اور حکایتیں بے شمار ہیں، ان کے مطالعہ کا جس کسی کو شوق ہو وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

شاہ تراب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ان اکابر کے قلوب میں منشاء محبت جذبہ باطنی، فیضِ رحمانی ہوا کرتا تھا نہ کہ وسوسۂ حظوظِ نفسانی اور ان کا مقصود دردِ محبت کا حصول تھا نہ کہ خوش دلی و راحت کا خیال:

غرضِ عشق توام چاشنیٔ درد و غم است
ورنہ زیرِ فلک اسبابِ تنعم چہ کم است

جو لوگ نفس و ہوا کے قیدی ہیں اور مقتضیاتِ قوای شہوانی سے اپنے دل کا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور حظِ نفسانی، کا نام "فیضِ روحانی" رکھتے ہیں وہ قطعاً مذہبِ عشق و عاشقی سے باہر ہیں!

عشق ار نہ کمالِ نفسِ آدم بودے ‏ ‏ آوازۂ عشق از جہاں گم بودے

قومے کہ نیامد ند در عشقِ تمام کے شاید شاں در حرمِ عشق مقام

اور اس عشق کی علامت "سوختن و گداختن و از حظوظ نفس پر داختن" ہے یعنی سوز و گداز اور نفس کی لذتوں سے دستکش ہونا ہے۔ اس مفہوم کو شاعر نے اپنی زبان میں کیا خوب ادا کیا ہے:

معشوقہ کہ شد ز کا مہا عاشق من گفتا کہ نہ بعاشقی لائق من!
وصل است ازمن کام تو آیدے ہستی تو عاشق کام خویش نے عاشق من!

محبت تو وہ ہے جو تمام چیزوں سے قطع تعلق کرے اور اس کی خواہش سرتا پا محبوب کی خواہش بن جائے۔ جامیؒ کی رباعی جو اس مفہوم کو نہایت خوبی سے ادا کرتی ہے اس سے قبل بھی ہم نے پیش کی ہے:

با عشق توام ہوا ز اندہ است و ہوس با آتشِ سوزندہ چساں ماند خس؟
خواہد ز تو مقصود دلِ خود ہمہ کس جامی از تو ہمیں ترا خواہد و بس!

اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ الٰہی محبت کا محرک جاذبہ ازلی ہوتا ہے اور اس شوق کا رشتہ محبوب لم یزلی کی جانب ہی سے ہوتا ہے۔ اگر عالم ظاہری میں یہ عشق و محبت صور جمیلۂ امکانی سے متعلق ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے محب میں کوئی عارضۂ عیب پیدا نہیں ہوتا تو یہ ہزاروں ریاضتوں اور مجاہدوں سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ فنا لوازم عشق سے ہے خواہ یہ حق کے ساتھ ہو یا باطل کے ساتھ عشق محبت مفرط ہے اور قلب کو ایک شے پر جمع کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عشق و محبت میں یہ خصوصیت نہایت قوی ہوتی ہے کہ جس چیز کی طرف وہ اپنی پوری توجہ سے متوجہ ہوتا ہے اور اپنی ساری ہمت اس پر مرکوز کر دیتا ہے، اسی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اسی لیے طریق عشق در راہ محبت کو، گو وہ امور دنیویہ فانیہ ہی کے لیے

کیوں نہ ہو حسن سمجھا گیا ہو بشرطیکہ اسی کا ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس سے گزر جائے، جیسا کہ عارف رومی نے کسی موقع پر کہا تھا "کاش کہ گردے وگزشتے"۔

سالک کے لیے، جیسا کہ ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، حبِ عشقی اس لیے ضروری ہے کہ وہ حق سبحانہ تعالےٰ کی محبت کی تحصیل کا نہایت قوی سبب ہے۔ اس لیے تو کہا گیا ہے۔ لا شیئ اَبلغُ من العشق یعنی عشق سے زیادہ حق تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچانے والا کوئی شیٔ کامل نہیں ہو سکتا۔

گفتم طبیب را کہ مرا داروئے فرست — باشد کز اں طریق مدرماں تواں رسید

گفتا طبیب، دردِ دلِ عاشقاں خدا (نیست) — خاصہ و لیک از غمِ جاناں (معشوق ۱۲) بجاں رسید (حق تعالیٰ ۱۲)!

ان حقایق و دقایق کو پیش نظر رکھ کر، عاشق، کی اس غزل کو پڑھو اور لطف اندوز ہو:

حسن تو در حسنِ خوباں دیدہ ام — ایں حدیث از مصطفےٰ بشنیدہ ام

کل جمیل من جمال اللہ، گفت — ایں چنیں رمز از کسے نشنیدہ ام

عاشقاں بر حسن خوباں عاشقند — زاں سبب من حسن را بگزیدہ ام

دیدۂ اسود تا بدیدم من بعین — می نہ بینی گشت روشن دیدہ ام

دیدۂ دیدہ ام توی اے نورِ چشم — در تو دیدم نورِ حق پوشیدہ ام

آشنا گشتم چو با محبوب خویش — از ہمہ خویشان خود ببریدہ ام

جرعۂ از دست خود داد آں نگار — چوں شکر، چوں شہد خوش نوشیدہ ام

گردِ کعبہ چوں طوافِ حاجیاں — سالہا بر گردِ او گردیدہ ام

شیخِ عاشق گفت از عین الیقین — حسن تو در حسنِ خوباں دیدہ ام

باب (۶)
آثار و ثمراتِ عشق

عشق کے آثار و ثمرات کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے ہم ان مویدات کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں جن سے عشق کا شعلہ اپنی پوری قوت سے بھڑک اُٹھتا ہے اور جن کا ذکر اس وادی کے رہروؤں نے پوری تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

عشق کا سب سے عمدہ موید ریاضت ہے۔ یعنی "تقلیلِ منام و کلام و صحبت با انام" کم سونا اور کم بولنا اور خلق سے صحبت و اختلاط کا کم رکھنا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس ریاضت سے روحِ حیوانی رقیق ہو جاتی ہے یعنی اس میں رقت و لطافت پیدا ہوتی ہے اور جس قدر روح حیوانی رقیق ہوتی جاتی ہے اس میں عشق کی شورش اور گرمی سرعت سے پیدا ہوتی جاتی ہے۔

عشق کا ایک اور موید الحان خوش، آوازِ دلکش، قصص شوق آمیز اور اشعار عشق کا سننا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے اپنے شیخ کامل حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی قدس اللہ سرہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو چیز حُسن سے موصوف ہوتی ہے اس کا تعلق عالم علوی سے ہوتا ہے اور روح انسانی بھی اسی عالم سے ہے جب وہ نغمۂ خوش سنتی ہے یا کسی صورت کے حُسن کا مشاہدہ کرتی ہے تو اس کو اپنا وطن یاد آجاتا ہے اور وہ بے چین سی ہو جاتی ہے جس طرح کوئی شخص سفر میں ہو اور اس کے وطن سے خط آئے تو اس کے قلب کی عجیب حالت ہو جاتی ہے، یہی حال روح کا سمجھ لو۔ ایسے وقت اگر کوئی شخص اپنے قلب کو مراقبہ یا ذکر

شہود یا ذکر خفی کی طرف متوجہ کر دے تو اس کی روح کو بہت جلد عروج نصیب ہوگا۔ چنانچہ جب حضرت شیخ فریدؒ سماع سنتے تو مراقب ہو جاتے اور روح کو سیر وطیر میں مشغول کر دیتے۔ محققانہ سماع دراصل یہی ہے[1]۔ اور یہ عشق الٰہی کے پیدا کرنے کا ایک نہایت قوی سبب ہوتا ہے

عشق کے مویدات میں سے یہ بھی ہو کہ ان امور سے پرہیز کیا جائے جو روح طبعی میں کثافت پیدا کرتے ہیں، جیسے بہت سونا، ہمیشہ کثیف غذاؤں کا کھانا اور اسی قسم کی چیزیں جو تجربہ کار افراد سے مخفی نہیں۔

آثارِ عشق

عشق یا حب عشقی کے آثار یا نشانیاں بہت ساری ہیں۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) اس حب کا اقتضاء حجاب بشری کا چاک کرنا اور روح کا اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا ہو۔ کسی خاص قانون کی مطابقت اس کے اقتضائے ذاتی میں داخل نہیں ہوتی، خواہ وہ قانون شرع ہو، خواہ قانون ادب، اور نہ کسی کی رضا و خوشنودی کی طلب اس کے اقتضائے ذاتی میں داخل ہو، خواہ محبوب کی رضا ہو یا غیر محبوب کی، اور نہ کسی کی متابعت کا التزام، خواہ محبوب کی متابعت ہو یا اس کے غیر کی۔ ہمارے اس بیان سے مقصود ہرگز یہ نہیں کہ اربابِ عشق و مواجید[2] قیود شرعیہ سے مقید نہیں ہوتے یا آداب عرفیہ سے متادب نہیں ہوتے رضائے مولیٰ کے طالب اور متابعت نبوی کے ملتزم نہیں ہوتے۔ حاشا وکلا یہ بات ہرگز نہیں، ہمارا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ یہ حب بالذات ان امور کی مقتضی نہیں، اس کا اقتضا صرف یہ ہوتا ہو کہ صاحب حال حضرت ذوالجلال کے جمال کے مشاہدہ میں مضمحل اور فانی ہو جائے اور بس جس طریقہ سے بھی یہ کیفیت میسر آئے گی۔ ظر[illegible] [illegible] و[illegible] مناسبت کو اس کے اقتضائے ذاتی میں دخل نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر اس صاحب حال کو اپنے

---

[1] خاتمہ (اردو ترجمہ) ص ۲۶ [2] مواجید جمع وجد، خلاف قیاس، وجد اس حالت کو کہتے ہیں جو صوفیا کو نغموں کے سننے سے پیدا ہوتی ہے

مقصود کے حصول میں یہ ظن ہو کہ وہ مزامیر کے سننے یا عشق مجازی میں گرفتار ہونے یا شغل[1] برزخ میں مشغول ہونے یا اپنے اوقات کو اذکار و طاعات سے خالی رکھنے سے یہ مقصود حاصل کر سکتا ہے تو اس کو صمیم قلب سے ان امور کی طرف میلان یا کشش پیدا ہو جاتی ہے، اگرچہ کہ صاحب حال، دیندار اور متشرع ہونے کی وجہ سے اس خیال کے آثار کے ظہور کو پسند نہ کرے بلکہ اس خیال کے دور کرنے کی کوشش بھی کرے۔

(۲) تَفَرُّد۔ اس محبت کا ایک اور اقتضا تفرد ہے، یعنی محبوب کے سوا سارے علایق کا قطع کر دینا اور تمام مشاغل کا ترک کر دینا اور امور متفرقہ کے نظم و ترتیب سے گھبرانا، مثلاً سیاست منزلی اور سیاست مدنی، جماعت، امامت، اہل قرابت و ذوی الحقوق کے حق ادا کرنے کا اپنے اندر حوصلہ نہ پانا...... یہی وجہ ہے کہ نکاح سے جو تمام علائق کی اصل ہے، عاشقوں کو نفرت اور وحشت ہوتی ہے!

(۳) علوم و طاعات ظاہرہ سے عدم اعتنا یا لاپروائی۔ چونکہ ان علوم سے پراگندہ امور میں نظم و ربط پیدا ہوتا ہے اور چونکہ عاشق کے کام میں بساطت ہی بساطت ہے لہٰذا ان امور میں اشتغال اس کے کاروبار کو پریشان کر دیتا ہے۔

(۴) شرع کے ظاہر و باطن میں جو تعلق پایا جاتا ہے اس کا نہ سمجھنا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت کا ایک باطن ہوتا ہے اور ایک ظاہر۔ باطن تو قلب کا حق سبحانہ تعالیٰ سے ربط و تعلق ہے اور اس تعلق کے مختلف ڈھنگ ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا نام "نسبت" رکھا جاتا ہے۔ اور شریعت کا ایک ظاہر بھی ہوتا ہے اور وہ اوامر شرعیہ کا بجا لانا اور اس کے منہیات سے باز رہنا ہے۔ ان افعال ظاہرہ اور تعلقات قلبیہ کے

---

[1] شغل برزخ سے صوفیا کی مراد اپنے مرشد کی صورت مثالی ظاہری کا مراقبہ ہے جو ان کے تجربہ میں تصفیۂ قلب و دفع خواطر و وساوس کے لیے نہایت مفید ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے بھی اسی غرض کے حصول کے لیے اس شغل کی تاکید فرمائی ہے۔ دیکھیے ان کے مکتوبات۔

درمیان ایک لطیف علاقہ ہوتا ہے، جو شخص اپنے وجدان سے اس علاقے کو پالے اس کی عبادت تو سراسر مغز بے پوست ہو جاتی ہے۔ اور اس کے احوال اس کے افعال کیساتھ ممتزج ہو جاتے ہیں، ورنہ وہ شخص "قشری محض (پوست ہی پوست)" و متقشف (زاہد خشک) ہو جاتا ہے۔ اگر ظاہر افعالِ شرعیہ سے اس کا تمسک ہو، ورنہ ایک گونہ اتحاد اس کے عقاید میں آجاتا ہے، اگر وہ باطن شرع سے متمسک ہو کر ظاہر شرع کو درجۂ اعتبار سے ساقط کردے۔ چونکہ اس علاقہ کا سمجھنا کثرتِ افعال کو وحدتِ احوال کے تحت لے آنا ہے۔ اس میدان میں حبِ عشقی کے عزیق کو جولان کی گنجایش نہیں!

حبِ عشقی کے ان آثار کی تفصیل شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صراطِ مستقیم[1] میں کی ہے اور ہم نے اسی کتاب سے استفادہ کرکے سادہ زبان میں اس کو اوپر پیش کیا ہے تفصیل کے لیے اس کتاب کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔

ثمراتِ عشق

عاشقانِ جمالِ ذوالجلال کو یہ عشق جہاں سوز جو ثمرہ عطا کرتا ہے اس کا بیان تو الفاظ میں ممکن ہی نہیں کیفیات کو تعقلات کی زبان میں پیش کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ذوق و وجدان ہی سے ان کا علم ہو سکتا ہے بہرحال ان عشاق نے عشق کے ثمرات کا الفاظ میں جو نقشہ کھینچا ہے اس کو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ[2] نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

(۱) جب کیفیت عشقیہ کی حدّت و شدّت، تجلی الٰہی کے جذب کی قوت اور روح الٰہی کے کمال انجذاب کی وجہ سے عالم شہادت و عالم مثال کا غبار منکشف ہو جاتا ہے اور ظلمانی و نورانی حجاب چاک ہو جاتے ہیں تو وعدۂ الٰہی:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (پ ۲۱ ع ۲) — اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھائیں گے۔

اور فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (پ ۲ ع ۲) مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا۔ پورا ہوتا ہے

---

[1] صراط مستقیم (اردو ترجمہ) کتب خانۂ رحیمیہ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی ص ۱۰ تا ص ۱۴ [2] صراط مستقیم ص ۱۲ و ۱۳

اور جمال لایزال ذوالجلال میسر آتا ہے، اور قرب و معیت کے معنے جو مضمون ان اشارات کا ہے

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ — میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں۔

اور اَنَا مَعَہٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ — میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے۔

اور اِحْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ تُجَاھَکَ — تو اللہ کو یاد رکھ اس کو اپنے سامنے پائے گا۔

اور جس کو وصال[1] سے تعبیر کرتے ہیں، ظاہر ہوجاتا ہے اور جو تب و تاب، قلق و اضطراب حرمان و ہجران کے وقت برداشت کیا تھا وہ سرور و ابتہاج سے بدل جاتا ہے، اور ہم کلامی محرومی جدائی و سرگوشی کی دولت نصیب ہوتی ہے اور پریشانی الفت سے اور وحشت انست سے بدل جاتی ہے:

چنانچہ شیخ بہاؤ الدین ابراہیم عطاء اللہ انصاری اپنے رسالہ میں تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اب تجلیۂ روح ہوتا ہے اور اس مرتبۂ بلند کے بعد مقامِ خلافت حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے:

الصوفی اذا انسلخ من قشر البشریۃ	جب صوفی بشریت وظلمت کے پوست سے کھینچ لیا جاتا ہے
والظلمۃ وصفت قلبہ وخلت روحہ فامرہ	اور اس کا قلب صاف ہوجاتا ہے اور اس کی روح تعلقات
بید ذالک ای امر اللہ یفعل الصوفی	سے نکل آتی ہے تو اس کا حکم حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوجاتا ہے یعنی
یفعل کیف یشاء باذنہ	حکم حق فعل صوفی ہوجاتا ہے صوفی حق تعالیٰ کے حکم سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اب وہ جو کچھ کرتا ہے حق تعالیٰ کے حکم سے کرتا ہے، جو کچھ کہتا ہے اس کے حکم سے کہتا ہے، جو کچھ دیکھتا ہے اس کے حکم سے دیکھتا ہے، اس حالت کو اتصاف[2] کہتے ہیں

---

[1] وصال صوفیا کی اصطلاح میں یہ ہے کہ سالک کو اپنی ہستی و تعین مجازی سے جدائی حاصل ہو اور اس کا اپنا تعین بھی جو خلق کا حق سے امتیاز کا سبب ہے مرتفع ہوجائے یعنی وہ اپنی خودی سے بالکل بیگانہ ہوجائے اور ہستی و تعین تجلیٔ احدی میں فنا و محو ہوجائے جیسا کہ صاحب گلشن راز نے لکھا ہے ؏

وصال حق ز خلقیت جدائی ست — ز خود بیگانہ گشتن آشنائی ست

[2] اتصاف۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اتصاف سے مراد بندہ کا حق تعالیٰ کی ذات و صفات سے متصف

(باقی صفحہ ۲۰۲ پر)

اتحاد نہیں کہتے کیونکہ تمام اکابر صوفیا کے ہاں اتحاد و حلول[1] باطل قرار دیا گیا ہے۔

جب لوہے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے تو لوہا آگ کی صفت اختیار کر لیتا ہے بلکہ آگ ہی کے نام سے پکارا جاتا ہے، جو بھی آگ سے صادر ہوتا ہے لوہے سے بھی صادر ہوتا ہے اور یہ جلانے کا فعل ہے۔ بعض دفعہ صوفی کو ناسوت سے نکال کر عالم ملکوت میں لے جاتے ہیں اور بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ صوفی کا باطن تو عالم ملکوت میں ہوتا ہے اور اس کا ظاہر عالم ملک میں اور حضرت رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ قول،

کن مع الخلق ومع الحق بالظاھر	خلق کے ساتھ اور حق کے ساتھ رہ، ظاہر میں
مع الخلق و بالباطن مع الحق	خلق کے ساتھ اور باطن میں حق کے ساتھ اس
بحیث لا یشغلک الخلق عن الحق	طرح کہ خلق تجھے حق سے نہ روکے اور حق
والحق عن الخلق	تجھے خلق سے نہ روکے۔

اس طرف اشارہ کرتا ہے،

یہی مقام اقتدار ہے اور مرتبۂ ولایت[2] و مشیخت اس مرتبہ کے سوا کسی اور جگہ تصور نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ کہا گیا ہے،

الشیخ ھو الکائن والبائن — شیخ وہ ہے جو حاضر بحق اور غائب از خلق ہوتا ہے

(باقی حاشیہ صفحہ ۱) ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ہاں یہ مسئلہ مشہور رہا کہ درحقیقت ذات و صفات تو صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ہیں اور بندے کی ذات و صفات محض اعتباری و مجازی ہیں اور بندہ کے ذات و صفات حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے ظل ہیں۔

[1] حلول و اتحاد مسائل عویصہ میں سے ایک مسئلہ ہے۔ حلول ایک شئے کا دوسری شئے میں داخل ہونا ہے جیسے پانی کا کوزہ میں داخل ہونا۔ اور اتحاد ایک چیز کا دوسری شئے سے مل جانا ہے جیسے دودھ کا پانی میں مل جانا۔ ذات حق اور ذات عبد میں یہ نسبت نہیں، یعنی ذات حق ذات عبد میں نہ داخل ہوتی ہے اور نہ اس سے متحد ہوتی ہے اگر کوئی اس کا قائل ہو تو یہ کفر ہے۔ کیونکہ دو جنسوں کا ایک دوسرے میں داخل ہونا یا آپس میں متحد ہونا حلول و اتحاد ہے۔ صوفیا کے عقیدہ کی رو سے عبد و رب دو جنس یا شئے ہے ہی نہیں، وجود حق کے سوا عبد کا وجود نہیں۔

[2] اصطلاح صوفیا میں ولایت سے مراد حق تعالیٰ کا مقرب ہونا اور سالک کی خودی کا فنا ہو جانا اور حق تعالیٰ سے قائم ہو جانا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کو مقام قرب و تمکین کی انتہا تک پہنچا دے۔

اور مقام مشیخت مقام ولایت سے بالاتر ہوتا ہے

لان مقام الولایۃ ھو الفناء فی اللہ والبقاء باللہ والظھور باسم اللہ وصفاتہ، والمشیخۃ ھو التصرف فی العالم الملک والملکوت باذن اللہ	کیونکہ مقام ولایت سے مراد فنا فی اللہ و بقاء باللہ اور اسم الٰہی وصفات الٰہی کے ساتھ ظہور ہے اور مشیخت سے مراد عالم ملک وملکوت میں بحکم الٰہی تصرف کرنا ہے

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اس اجمال کی اس طرح تفصیل فرماتے ہیں۔

جب لوہے کے ایک ٹکڑے کو آگ میں ڈال دیا جاتا ہے اور آگ کے شعلے ہر طرف سے لپک کر اس کا احاطہ کر لیتے ہیں اور آگ کے لطیف اجزاء اس ٹکڑے کے جوہر میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس کی شکل اور رنگ کو اپنے مانند کر لیتے ہیں اور گرمی اور احراق (جلانا) جو آگ کی خاصیت ہے اس لوہے کے ٹکڑے میں پیدا کر دیتے ہیں تو اس وقت اس کا شمار بھی آگ کے انگاروں ہی میں ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس وجہ سے نہیں اس لوہے کی حقیقت یا ذات آگ کی حقیقت یا ذات سے مبدل ہوگئی، کیونکہ یہ تو بدیہی البطلان ہے بلکہ یہ لوہے کا ٹکڑا تو حقیقت میں لوہا ہی ہے لیکن آگ کے شعلوں کے ہجوم سے اس کا لوہاپن اپنے احکام و آثار کے ساتھ پوشیدہ ہوگیا اور جو احکام و آثار آگ سے منسوب ہوتے ہیں وہی اس سے مترتب ہونے لگے، بلکہ ایسا کہنا بھی درست نہیں کہا یوں جانا چاہیے کہ یہ احکام و آثار اب آگ ہی سے مترتب ہو رہے ہیں جو اس لوہے کے ٹکڑے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں لیکن چونکہ آگ نے اس لوہے کے ٹکڑے کو اپنا مرکب بنا رکھا ہے اور اپنا تخت سلطنت قرار دے رکھا ہے، اس لیے ان احکام و آثار کی نسبت اس لوہے کے ٹکڑے کی طرف کی جا سکتی ہے، چنانچہ آیت:

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (پ ۱۶ ع ۱) اور کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا

اور اَرَادَ رَبُّكَ (پ ۱۶ ع ۱) آپ کے رب نے چاہا

میں اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔

مختصر یہ کہ اگر اس لوہے کے ٹکڑے کو اس حال میں بولنے کی قوت ہوتی تو سو زبانوں سے وہ اپنی اور آگ کی عینیت و اتحاد کا شور و غل مچاتا اور کچھ دیر کے لیے اپنی حقیقت سے غافل ہو کر چیخ اٹھتا کہ میں آتش سوزاں کا انگارہ ہوں، اور میں تو وہ ہوں جس سے لوہاروں، سناروں اور باورچیوں، بلکہ تمام پیشہ وروں اور کاریگروں کے کاروبار وابستہ و مربوط ہیں! اسی طرح جب طالب کے نفس کامل کو جذب و کشش رحمانی کی موجیں احدیت[1] کے سمندر کی گہری تہ میں کھینچ کر لے جاتی ہیں تو بے اختیار اس کی زبان سے:

	انا الحق	میں ہی حق ہوں
اور	لیس فی جبتی سوی اللہ	میرے جبہ میں اللہ کے سوا کوئی نہیں
اور	سبحانی ما اعظم شانی	میں پاک ہوں اور میری شان بھی کتنی بلند ہے
اور	انا الفاعل فی ھذا العالم	میں ہی اس عالم میں فاعل ہوں

کی صدائیں[2] بلند ہوتی ہیں! اور حدیث قدسی:

کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ	میں اس کا کان ہو جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے
الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بھا	اور آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ
ورجلہ التی یمشی بھا (الحدیث) رواہ البخاری	ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے (بخاری) اور دل
وفؤادہ الذی یعقل بہ ولسانہ	ہو جاتا ہوں جس سے وہ سمجھتا ہے اور زبان ہو جاتا ہوں
الذی یتکلم بہ۔ (شرح مشکوٰۃ)	جس سے وہ بولتا ہے (شرح مشکوٰۃ)

اسی حال کی حکایت ہے اور حدیث:

قال اللہ علی لسان نبیہ: سمع اللہ لمن حمدہ	اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے فرمایا: اللہ نے حمد کرنے والے کی سن لی۔
اور حدیث: یقضی اللہ علی لسان نبیہ ما شاء	اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے حکم کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

---

[1] احدیت اصطلاح صوفیہ میں مرتبۂ ذات ہے جہاں صفات و اسماء و نسب و تعینات کا اعتبار بھی ساقط ہوتا ہے۔

[2] حضرت علیؓ کی طرف یہ قول منسوب ہے: "انا القلم، انا اللوح المحفوظ و انا العرش و انا الکرسی و انا السمٰوات السبع و الارض"۔

اسی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یہ ایک نہایت باریک بات ہے اور نہایت نازک مسئلہ ہے، اس پر بہت غور و تامل کی ضرورت ہے:

ودراء ذالك فلا اقول لانہ سرٌ لسان النطق عنہ اخرس[1]

اس مقام پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا روئے سخن منکرین کی طرف ہو جاتا ہے اور فرماتے ہیں:

اس معاملہ پر تعجب نہ کرنا اور انکار سے پیش نہ آنا، کیونکہ جب وادیٔ مقدس طویٰ کی آگ سے یہ ندا آئی کہ،

انی انا اللہ رب العالمین (پ ع) میں اللہ ہوں تمام جہانوں کا پروردگار

اننی انا اللہ لا الہ الا انا (پ ۱۶ ع ۱۰) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔

تو پھر نفس کامل سے جو اشرف موجودات اور نمونہ حضرت ذات سبحانہ تعالیٰ ہے انا الحق کی آواز کا صادر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ فافہم و تدبر۔

(۲) اس مقام کے لوازم سے عجیب و غریب خوارق و کرامات کا صادر ہونا اور تاثیرات قویہ کا ظاہر ہونا، دعاؤں کا مستجاب اور مقبول ہونا اور بلاؤں اور آفتوں کا دور ہونا ہے، حدیث قدسی،

لئن سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعیذنہ۔ اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اس کو دوں گا، اگر مجھ سے پناہ طلب کرے تو ضرور اس کو پناہ دوں گا۔

اسی معنی کی تصریح کرتی ہے۔

(۳) اس مقام کے لوازم سے یہ بھی ہے کہ ایسے صاحب حال کے اعدائے بداندیش پر وبال آتا ہے اور مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ چنانچہ حدیث قدسی "

من عادی لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب۔ جس نے میرے دوست سے دشمنی کی اس کو میں جنگ کے لیے للکارتا ہوں۔

" میں اسی چیز سے باخبر کیا گیا ہے۔

---

[1] اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ ایسا راز ہے کہ بولنے والی زبان اس سے گنگ ہے۔

(۴) جب کوئی لطیفہ غیبی یا پردۂ لاریب سے کوئی جذبہ جدید طالب کو نصیب ہوتا ہے تو اس کے ادراک کو بڑی وسعت حاصل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے تمام حقائق کونیہ اور موجودات امکانیہ ذات بیچون کے سامنے مضمحل ہو جاتے ہیں۔ نیست و نابود نظر آنے لگتے ہیں۔ اور جو نسبت پہلے طالب کے نفس اور حق تعالیٰ کی ذات کے درمیان ظاہر ہوئی تھی وہی نسبت اب ہر ان چیزوں میں، جو عرصۂ وجود میں ظہور پذیر ہے، اور حق سبحانہٗ کی ذات کے درمیان ظاہر ہونے لگتی ہے۔ غرض بساطِ وجود پر حق تعالیٰ کی قیومیت کا انبساط اور ان حقائق متکثرہ کا قیام جو اس ذات واحدہ و یکتا کے ساتھ ہے کھل جاتا ہے اور آیتِ کریمہ

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ [illegible]

(وہ اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے)

اور حدیث:

والذی نفس محمد بیدہ لو انکم دلیتم بحبل الی الارض لهبط علی اللہ (رواہ احمد و ترمذی)

قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے اگر تم رسی کو زمین کے آخر تک چھوڑ دو تو البتہ اللہ تعالیٰ پر جا پڑے گی۔

کے مفہوم کا اظہار ہونے لگتا ہے۔

سبحان اللہ عشق کی کیا اچھی تاثیر ہے اور تجلی علمی کا کیا خوب جذب ہے کہ ایک مشت خاک اس مقام مقدس و پاک میں کس قدر چالاک ہو جاتی ہے اور یہ بے قدر مٹی رب الارباب کی مجلس قرب میں کیا خوب مقام کریم حاصل کر لیتی ہے۔ عارف رومی نے اپنے جذبات کا اس موقع پر یوں اظہار کیا ہے:

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشقِ جان طور آمد عاشقا — طور مست و خرّ موسیٰ صاعقا!

یعنی عشق کا وہ جذب ہے کہ اس کی وجہ سے جسم خاکی افلاک پر پہنچ جاتا ہے جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم شب معراج میں افلاک پر پہنچ گئے اور یہی حال عیسیٰ وادریس علیہما الصلوٰۃ والسلام کا ہوا، اور کوہ طور عشق ہی کی وجہ سے رقص کرنے لگا، اور قبول تجلی حق کے لیے چالاک ہوگیا، اور جب کوہ طور عشق کی وجہ سے رقص کرنے لگا اور ظاہر ہے کہ جسم کی حرکت جان ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے تو عشق کو جان طور ہی کہنا پڑے گا، یا عشق کو وہ شراب سمجھنا ہوگا جس سے کوہ طور مست ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہوگئے

(۵) اسی مقام کے لوازم سے یہ بھی ہے کہ وحدت الوجود کا نعرہ بلند کیا جائے اور معارف الٰہیہ پر زبان کھولی جائے چنانچہ عارف رومی کی زبان سے یہ ترشح نکلی:

سرِ پنہان است اندر زیر و بم — فاش گر گویم جہاں برہم زنم
آنچہ نے می گوید اندر این دو باب — گر بگویم من جہاں گردد خراب
جملہ معشوق است وعاشق پردۂ — زندہ معشوق است وعاشق مردۂ

اور شیخ فریدالدین عطار پکار اٹھے:

سر بسرم جان جانم تن نیم — تن نیم بالقد یارا ان من نیم
نور پاکم آمدہ در مشت خاک — کور چشماں را ولے روشن نیم
نور نورم نورِ نورم نورِ نور — تن چراغ پنبہ و روغن نیم

وحدت وجود کا مفہوم بقول مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جملہ موجودات من حیث الوجود عین معشوق ہیں جو ذات حق ہے اور عاشق ذات حق کا پردہ ہے

ف نے کے اصطلاح صوفیہ میں چند معنی ہیں مولانا جامیؒ فرماتے ہیں کہ "نے" کاملان واصلان حق سے ہے جو اپنی خودی سے خالی ہوگئے ہیں مناسبت تمام ہے چنانچہ ان کا شعر ہے کیست نے آنکس کہ گوید دمبدم من نیم جز موج دریائے قدم شاہ فیع قلندر قدس سرہ فرماتے ہیں کہ نے سے مراد ذات سرور انبیا صلعم ہے۔ کیونکہ نے کی آواز در حقیقت نائی کی آواز ہوتی ہے، اسی طرح آپ کے جملہ افعال واقوال، حرکات وسکنات حق تعالیٰ ہی سے صدور پذیر ہوتے تھے۔

اس جہت سے کہ ذات حق کا ایک تعین ہے اور شئون حق سے ایک شان ہے!

یہ ہیں حب نفسانی کے وہ احکام جن کا بیان یہاں ضروری سمجھا گیا، ان احکام کی تفصیلی شرح اور خصوصاً مقام فنا و بقا کی تفصیلات صوفیائے کرام کی کتابوں کے مطالعہ[1] سے حاصل ہو سکتی ہیں یا پھر کسی عارف تام المعرفت کی زبان سے سمجھی جا سکتی ہیں۔

اب ہم ایک مناجات پر اس کتاب کو ختم کرتے ہیں:

اے فروغ جمال تو خوباں — پرتو خوبی تو محبوباں!
جلوۂ حسن تو کجاست کہ نیست — جذبۂ عشق تو کراست کہ نیست؟
ہمہ ذرات مست عشق تو اند — پائے کوباں ز دست عشق تو اند
حسن لیلے کہ راہ مجنوں زد — گامش از کوئے عقل بیروں زد
زلف عذرا کہ صبر وامق برد — دل و جانش برنج و غصہ سپرد
لعل شیریں کہ شد ز شکر ریز — قوت فرہاد و قوت پرویز
دل محمود را کہ برد ایاز — ساخت سرگشتہ اش بکوئے نیاز
یک بیک نشأۂ جمال تو بود — کہ در اطوار مختلف بنمود!!
زد بہر جا رہِ اسیر دگر — صبرش از دل ربود و ہوش ز سر
بکمند خودش مقید کرد — رو دلش از ہر دو کون در خود کرد
من ہم اے بادشہ گدائے تو ام — ہدف ناوک قضائے تو ام
چند سرگشتہ داریم چوں گوئے — بے سر و پا دوانیم ہر سوئے
گر بری در بر حرم باتم — گر شوی قبلۂ مناجاتم!
گہ بصلحم کشی و گاہ بجنگ — گہ بشہدم کشی و گہ بشرنگ
بدر اہل درد راہم دہ — بصف عاشقاں پناہم دہ
سر من خاک پائے ایشاں کن — حرز جانم دعائے ایشاں کن
خاطرم رام باکشاکش شاں — وقت من خوش ز قصۂ خوش شاں

---

[1] قرآن و تصوف میں تمہیں اس اجمال کی تفصیل ملیگی۔